اضافہ شدہ ایڈیشن

مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی

قرآنِ حکیم کی روشنی میں

محمد اشرف ظفر

CamScanner

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب ---------- مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی
(قرآن حکیم کی روشنی میں)

مؤلف ---------- محمد اشرف ظفر

مطبع ---------- زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

طبع ---------- دوم

صفحات ---------- ۶۸۵

قیمت ---------- -/400روپے

اشرف پبلی کیشنز لال پل، مغلپورہ، لاہور

محمد اشرف ظفر گلی نمبر ۱۸ نبی پورہ، لال پل، مغلپورہ، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

مکتبہ اخوت اردو بازار لاہور

اللہ تعالےٰ کا ارشاد

(بحوالہ قرآنِ حکیم)

ہر نبی اس ضابطہ کی رُو سے وحدت پیدا کر کے چلا جاتا لیکن اس کے بعد وہ لوگ جنہیں وہ ضابطہ دیا گیا تھا باوجود ایسی واضح تعلیم کے باہمی ضد اور مخالفت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے خیال سے پھر اختلافات شروع کر دیتے۔

لیکن ان میں سے جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے انہیں خدا اپنے قانون کے مطابق اختلافات سے بچنے کی راہ دکھا دیتا۔ یہی وہ طریق ہے جس سے اللہ ہر اُس قوم کو جو اختلافات سے بچنا چاہتی ہے۔ زندگی کی توازن بدوش سیدھی راہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔

انتساب

کرۂ ارض پر بکھری ہوئی بنی نوع انسان کے نام

جسے قرآن حکیم نے

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

کی تابندہ اور نتیجہ خیز تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا

حکم دیا۔

تاثرات

۲۶ مئی ۱۹۸۷ء

(ڈاکٹر) مسکین علی حجازی صدر شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

آپ نے ایک ایسا موضوع منتخب کیا ہے جو عصر حاضر میں عالم اسلام کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ تاحال اس مسئلہ کا حل تلاش نہیں ہوا۔ فرقہ بندی عالم اسلام کی سب سے بڑی کمزوری بن چکی ہے۔ عالم اسلام دنیا کے بائیس فیصد رقبہ پر محیط ہے۔ اس کا محل وقوع بے حد اہم ہے اس کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا بیس فیصد ہے۔ لیکن طویل مدت سے حال یہ ہے کہ ؏ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

فلسطین۔ افغانستان کشمیر، مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بھارت۔ اری ٹیریا۔ فلپائن اور کئی دوسرے ملکوں میں خون مسلم کی ارزانی ہے۔ دنیا میں جتنے مہاجرین اور پناہ گزین ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے ایک ارب انسان بستے بھی ہوں مگر متحد ہوں تو ایٹمی طاقت بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مگر مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی نے ان ایک ارب انسانوں کو ان گنت خانوں میں تقسیم کر کے انہیں یکسر غیر موثر بنا رکھا ہے۔

اختلاف کی بنیاد نیک نیتی پر ہو تو وہ رحمت ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ نیک نیت انسان مؤثر دلیل کو تسلیم کرے گا اور صحیح بات جان لے گا لیکن اختلاف اگر اپنی انفرادی۔ اقتصادی سماجی یا سیاسی اغراض کی پیداوار ہو تو وہ کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مسلمات پر کوئی اختلاف نہیں۔ مگر فروعی اختلافات کو اس لئے نمایاں کیا گیا ہے کہ یہ اغراض کی پیداوار ہیں سیاست کو تو عرف عام میں گندا کھیل کہا جاتا ہے اس کھیل میں لوگ قومیں اور ملک بیچ دیتے ہیں۔ غداری کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دنیا کا سودا چکا دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔

"مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی" میں عالم اسلام میں خصوصاً ملت پاکستان کے مسائل کا بے لاگ تجزیہ کیا گیا ہے مذہب اور سیاست کے حوالے سے مذہبی اور سیاسی رویوں، رجحانات۔ اقتصادیات اور شخصیات کا محاکمہ مدلل اور محکم ہے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہ جاتی۔ قائداعظم رح کے حوالہ سے جو مباحث شامل اشاعت کئے گئے ہیں وہ فکر انگیز ہیں اور ان لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ہیں جو دشمن کی عیاری کو نہیں سمجھتے۔ اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر قوم کی تقدیر بدلنے والوں کی عظمت کا اعتراف نہیں کرتے۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے دامن عمل میں لاحاصل گفتار کے سوا کیا ہے؟

اشرف ظفر صاحب نے وہ تمام باتیں کہہ دی ہیں جو نئی نسل کے ذہن میں کلبلا رہی ہیں انہوں نے صحیح خطوط پر کام کیا ہے اور بڑی عرق ریزی کی ہے۔ سیاسی دکانداریوں اور مذہبی فرقہ بندیوں سے بیزار لوگوں کے لئے اس کتاب میں بہت کچھ موجود ہے۔ فاضل مصنف نے ارشادات خداوندی کی روشنی میں وہ راہ تجویز کی ہے جو اتحاد اور اجتماعیت کی راہ ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اس راہ پر گامزن ہوں۔ مفادات پرست نام نہاد مسلمانوں کو گروہوں۔ فرقوں، دھڑوں۔ صوبوں، علاقوں اور انفرادیتوں کی طرف کھینچ رہے ہیں اور پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ زندہ وہ رہتے ہیں جو وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے ہیں۔ اس کتاب کا مختصر جائزہ بھی وقت اور تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ میں فاضل مصنف کو اس کاوش پر مبارکباد کہتا ہوں۔

CS CamScanner

مکرمی جناب اشرف صاحب

السلام علیکم

آپ کی عنایت کردہ کتاب (مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی) کا مطالعہ کیا ہے۔ بہت خوب ہے۔ اس موضوع پر ایسی کتاب کا دیر سے انتظار تھا۔ آپ نے محنت اور کوشش سے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس علمی کارنامے پر مبارک باد قبول کیجئے۔

بعض مقامات پر آپ نے حوالہ جات ثانوی مصادر سے لئے ہیں اگر وہاں مصادر اصلیہ کا حوالہ دیا جائے تو کتاب زیادہ مستند اور مفید بن جائے گی۔

والسلام

آپکا مخلص

(ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ)

جناب محمد اشرف ظفر،
معرفت پوسٹ بکس نمبر 4190،
لاہور - 25 -

روزنامہ نوائے وقت

روزنامہ نوائے وقت

نام کتاب : مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی قرآن حکیم کی روشنی میں ایک جائزہ ایک تجزیہ

مصنف : محمد شرف ظفر

ضخامت : ۵۷۶ صفحات، کتابت طباعت اچھی، مجلہ

قیمت : ۱۲۰ روپے ملنے کا پتہ : محمد اشرف ظفر پوسٹ بکس نمبر ۹۴۹ لاہور ۱۵

زیر نظر کتاب ایک حساس پاکستانی کے ان مخلصانہ جذبات کے حوالے سے تربیت پانے والی تخلیق ہے۔ جو تاریخی شعور کی بنیاد پر دور حاضر کی لخت لخت امت کو زوال آمادہ دیکھ کر راتیں آنکھوں میں کانٹے سے پیدا ہوتے ہیں چھوٹے چھوٹے کتابی اور اخباری تراشوں، فکر انگیز واقعاتی اقتباسات اور ذاتی مشاہدات کی مدد سے فاضل مصنف نے "مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی" کی صدارت میں ایک ایسا آئینہ خانہ پیش کیا ہے جس میں ہر پڑھنے اور دیکھنے والا اپنی اور اپنے گرد و پیش کی تصویر دیکھ کر ایک خاص نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ کتاب کو تین حصوں اور اٹھارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب قرآن حکیم کی عظمت مفکرین کی تقاریر کے اقتباسات اور اہم کتابوں کے حوالوں، دوسرا مقام فقہ، تیسرا کتاب سنت، چوتھا مقام حدیث، پانچواں قرآت کا اختلاف، چھٹا ناسخ و منسوخ، ساتواں اسلامی آئین کی تدوین اور علماء کرام آٹھواں علماء کی علمی سطح دانشوروں کی نظر میں، نواں باب مذہب اور دین میں فرق، دسواں، ہماری مساجد، گیارہواں تصوف بارہواں ہماری تاریخ، تیرہواں عورت کی حالت زار، چودھواں قرآن حکیم کا معاشی نظام، پندرواں تعلیم، سولہواں قائداعظم اور علامہ اقبال کی رفاقت، سترہواں سیاسی فرقہ بندی اور اٹھارہواں دنیا کی حالتِ زار کے حوالے سے دیئے ہیں۔ مذہب اور سیاست میں فرقہ بندی کو بالواسطہ اسلامی امہ کی مجموعی ترقی اور اتحاد کے لئے انتہائی ضرر رساں عمل قرار دیا ہے۔ مرزا ادیب اور ظفر علی راجا نے بجا طور پر لکھا ہے کہ کتاب میں ایسے راستے کی نشاندہی کی گئی ہے جسے اپنا کر اتحاد و یگانگت کی فردوس گم گشتہ کو دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خود محمد اشرف ظفر نے لکھا ہے کہ "قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں اس لئے قوم کے یہی وہ نئے افراد ہیں جنہیں یہ روشناس کرانے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے کہ قرآنی آئیڈیالوجی کیا ہے، پاکستان کی غرض و غایت سے مقصود کیا تھا اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں" حقیقت یہ ہے کہ بعض حوالوں سے محمد اشرف ظفر کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کتاب کی مجموعی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کاوش کو پسند کریں گے۔

بیدار سرمدی

۱۹ جولائی ۱۹۸۷ء

وطنِ عزیز پاکستان میں ہماری قوم یعنی اُمتِ مسلمہ جس شدید مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی میں گرفتار ہے اس کے تباہ کُن نتائج کے پیشِ نظر خالص قرآنی فکر کے حامل ایک صاحبِ درد نے نہایت دردمندی اور دل سوزی سے جذبۂ صادق کے ساتھ شبانہ روز کی محنت سے ایک ایسی دستاویز مرتب کی ہے جس میں گویا پاکستان کی حقیقی تاریخ سمٹ کر آ گئی ہے اور جو اہالیانِ پاکستان کے لیے ایک صاف شفاف آئینے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس آئینہ میں جو کچھ نظر آتا ہے، اِس سے نظریں چُرائی نہیں جا سکتیں۔

جناب محمد اشرف ظفر نے اس اپنی قسم کی منفرد دستاویز کو مختلف عنوانات کے تحت اس طرح ترتیب دیا ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے کے حالات و واقعات اور پاکستان بننے کے بعد کے تمام الم انگیز و تلخ ترین حقائق نہایت مربوط انداز میں کڑی بہ کڑی سامنے آتے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اخذ کیا گیا ہے ان بیانات و آراء، خیالات و افکار سے جو پاکستان کے دوست، دشمن، اپنے، پرائے، مشہور و معروف علماء اور دانشور سب جانی پہچانی ہستیاں مختلف وقتوں میں مختلف موقعوں پر ملک کے اخبارات اور اپنی تصانیف میں دیتے چلے آ رہے ہیں جو ہر گوشۂ زندگی میں اہلِ پاکستان کے نیک و بد کردار سمجھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اشرف صاحب نے کوئی تحریر کوئی اقتباس بغیر حوالے کے درج نہیں کیا۔ ہر ایک کی اشاعت کی تاریخ کی سند موجود ہے۔ اس طرح قریب چھ سو صفحات پر مشتمل یہ حقیقت نامہ بلکہ عبرت نامہ ایک جامع تصویر ہے اِس مملکتِ پاکستان کی جسے ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اس کے لیے بابائے پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے جو عظیم کردار انجام دیا اور اس مملکتِ خداداد میں قرآنی نظام قائم کرنے کا جو عظیم نصب العین وہ رکھتے تھے اشرف صاحب نے اپنی اس تحریری کاوش میں ان سچائیوں کو بھی بزبانِ دیگراں اُجاگر کیا ہے تاکہ کسی جانب داری کا شبہ پیدا نہ ہو۔ اسی طرح ملک و ملت کے تعلق سے اور ایسی بیسیوں حقیقتیں ہیں جو اکابرانِ وطن کی سوچ کو خود ان کی اپنی زبانی بے نقاب کرتی ہیں جن کو اشرف صاحب نے اس دستاویز میں محفوظ کیا ہے اور جن کے تحت ہونے والے واقعات اپنا تبصرہ، اپنا تجزیہ خود کرتے نظر آتے ہیں۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ وطنِ عزیز اور دینِ مبین سے سچا رشتہ رکھنے والے اشرف صاحب نے پاکستانی قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر بڑی ہمت، حوصلے اور جانفشانی سے یہ ضخیم کتاب مرتب کر کے ایک عظیم کام انجام دیا ہے۔ قابلِ صد تبریک و تحسین۔ خدا کرے اس سے جہاں ہماری جواں نسل پر اپنے دین و وطن کے حقائق کا انکشاف ہو اور وہ سچائی کو جان کر غور و فکر سے کام لیتے ہوئے راہِ مستقیم اختیار کر سکیں وہیں معاشرے کے سالخوردہ اور راہ گم کردہ لوگ بھی خود ساختہ مشرکانہ ماحول کی تاریکیوں سے نکل کر توحیدِ قرآنی کی روشنی میں آ سکیں اور مملکتِ پاکستان حقیقی اسلام کا گہوارہ بن جائے۔

خیر اندیش : ثریا عندلیب

۱۳ر جنوری ۱۹۸۷ء لاہور

تاریخِ انسانیت کے گہرے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جب سے اس کرّہ ارض پر "تیری اور میری" کا مسئلہ اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کے دور کا آغاز ہوا ہے، انسانیت طبقات میں تقسیم ہو جانے کے باعث بے شمار مصائب و آلام میں گرفتار ہے، اگر آپ افراد، خاندانوں، برادریوں اور ملکوں کے داخلی اور خارجی تضادات کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو ان تضادات اور تنازعات کے درمیان بنیادی طور پر دو طبقوں کی کشمکش نظر آئے گی، اس کشمکش کی شکلیں اور درجے حالات و زمانہ کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی کہ ان میں بنیادی طور پر دو ہی طبقے ہیں، ایک طبقہ جو محنت و مشقت کر کے کماتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو ان کی محنت کے ماحصل کو غصب کر لیتا ہے، دوسروں کی محنت پر پلنے والے اس طبقہ کو قرآن مترفین کہتا ہے۔ اور پھر یہ واضح کرتا ہے کہ تمام انبیاءِ کرام کی دعوت انہی فساد انگیز اور انسان دشمن قوتوں کے خلاف نعرۂ انقلاب تھی (سورہ سبا آیت ۳۴) تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا بھرپور بدلہ ملے ۵۳/۳۹ اور محنت کش کو کسی قسم کے ظلم اور دھاندلی کا خوف نہ ہو ۲۰/۱۱۲، ظاہر ہے یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک محنت کش طبقہ کو اس طبقۂ مترفین کے کردار سے آگاہی نہ ہو جس کی اپنی بقا اس میں ہوتی ہے کہ محنت کرنے والے مختلف اور متحارب مذہبی اور سیاسی گروہ بندیوں میں جکڑے رہے،

زیرِ نظر کتاب میں اسی فرقہ بندی کے اسباب و محرکات اور نتائج و ثمرات کو قرآنِ حکیم کے حوالہ سے جس انداز اور کاوش سے سامنے لایا گیا ہے، اس کا مطالعہ خصوصاً نئی نسل کے لیے ناگزیر ہے۔ ضروری نہیں کہ مؤلف کے موقف کی مکمل طور پر تائید یا تردید کی جائے تاہم کتاب کے مکمل مطالعہ سے قبل اس کے متعلق کوئی بھی رائے قائم نہ کی جائے اور دورانِ مطالعہ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا کہا گیا ہے یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ کہنے والے کے متعلق ہماری پہلے سے کیا رائے ہے (انظر ما قال ولا تنظر من قال)

اس کتاب میں پاکستان کے نامور سیاسی رہنماؤں کے کردار کے متعلق خاکسار رہنما جناب محمد اشرف خان کا انٹرویو اور مذہبی پیشوائیت کی نفسیات کے متعلق جناب حافظ محمد یعقوب خان تاجیک کی خود نوشت سوانح حیات کے اقتباسات نظامِ عدل و اخوت کے قیام کی تڑپ رکھنے والوں کے لیے انتہائی قابلِ غور ہیں ـــــ اور آخر میں صرف یہ دیکھئے کہ قرآن کیا چاہتا ہے اور آپ کیا کر رہے ہیں؟

وہ بدلنا چاہتا ہے نظمِ میخانہ تمام
آپ نے بدلا ہے لیکن صرف میخانے کا نام

۱۴ فروری ۱۹۸۷ء

محمد علی فارق (ایم اے عربی۔ ایم اے سیاسیات)
مدیر اعزازی: ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" لاہور

مذہبی مسائل میں فکری اختلاف کو ہمیشہ باعثِ رحمت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جب اس فکری اختلاف کی سرزمین میں باہمی تعصّب اور ذاتی عناد کی تخم ریزی کردی جائے تو فرقہ واریت کا وہ سرطانی شجر پھوٹتا ہے۔ جس کے کانٹے کسی بھی اُمت کی تنومندی میں ضعف اور شکست و ریخت کا زہر پھیلا سکتے ہیں۔

اُمتِ مسلمہ کا فکری اختلاف جب تعصّب، عناد اور بے جا ضد کی بھینٹ چڑھ کر فرقہ واریت کی سنگدلانہ تصویر بن چکا ہے۔ اگر فرقہ واریت کی موجودہ بے رحم روایت کا تجزیہ مقصود ہو تو ان منفی رویوں کا شجرہ نسب تلاش کرنا پڑے گا جو دیانت دارانہ فکری اختلاف کی کوکھ سے نکلے اور اب رگِ مسلم کا لہو چاٹ چاٹ کر مرضِ کہنہ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں قرآن حکیم کی روشنی میں فرقہ بندی کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے برصغیر کے اکابرین اور پاکستانی سیاست کے عروج و زوال پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ اور اس راستے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جسے اپنا کر ہم اتحاد و یگانگت کی فردوسِ گم گشتہ کو دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فاضل مصنف کے نقطہ نظر سے اختلاف تو ممکن ہے۔ لیکن جن پہلوؤں کو اس کتاب میں اجاگر کیا گیا ہے ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

ظفر علی راجا

پاکستان کے ممتاز صحافی اور ادیب

مرزا ادیب

فون 213548

"لالۂ صحرا" چوہان روڈ، کرشن نگر، لاہور

جناب محمد اشرف ظفر نے اپنی اس نہایت مفید تصنیف میں کم و بیش ان تمام مسائل کا تجزیہ کر دیا ہے جو پہلے بھی نسل انسانی کو درپیش تھے اور آج بھی درپیش ہیں۔ اگرچہ ان مسائل میں یا تو اضافہ ہو گیا ہے یا ترامیم کے ذریعے ان کی شکلیں کسی کسی حد تک بدل گئی ہیں۔

یہ مسائل کیا ہیں؟ انتہائی اختصار سے کام لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ انسان جو دنیا میں آیا ہے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے آیا ہے جو خالق حقیقی نے اس کے سپرد کئے ہیں۔ سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ یہ مقاصد کیا ہیں اور انسان کس نوعیت کی جدوجہد اختیار کر کے ان کی تکمیل کر سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کے تین حصوں میں انہی مقاصد پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

ان کا تجزیہ بڑا مدلل، حقیقت پسندانہ ہے اور اسلوب بیان دلچسپ اور خوبصورت ہے۔

مجھے توقع ہے ہمارے ملک کے موجودہ دانشوروں میں محمد اشرف ظفر کی یہ بلند پایہ تصنیف ایک تحسین کی نظر سے دیکھی جائے گی

مرزا ادیب

۲۴ فروری ۱۹۸۷ء

— آدم زاد کو جہاں یہ کتاب، مذہبی و سیاسی فرقہ بندی، قرآن کا نظام العمل بتاتی ہے اور کتاب اللہ کی مبارک و مسعود تعلیم کا درس دیتی ہے وہاں موجودہ دور کے اُن تمام اسباب کی طرف توجہ دلاتی ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے زوال کا موجب بنے ہیں۔

— مشرکانہ گروہی اعتقادات، تاریخ سے منسوب غلط قصّے کہانیاں، اسلام کے نام پر غیر اسلامی تصوّرات، احادیث کے نام پر وضعی اور فرسودہ روایات، انصاف کے نام پر استبداد، مساوات کے نام پر معاشی استحصال اور قرآن کے نام پر غیر از قرآن طریقِ حیات، یہ ہے وہ فلسفۂ تعلیم اور یہ ہے وہ طرزِ معاشرت جسے اس قوم نے اپنا لیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہ قوم اپنی حرماں نصیبی کا سامان بہم مرتب کر رہی ہے

— اس کتاب کے مؤلف و مصنف ایک اچھے سخن شناس ہونے کے ساتھ ساتھ اصل واقعات تک پوری دسترس رکھتے ہیں۔ قرآن مجید پر ان کی گہری نظر ہے۔ اور اسی بنا پر فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ کا سبق قوم کو یہ دیتے چلے جاتے ہیں۔

— کتابِ حکمت کا وہ حُسن اور خیر کا وہ عنصر جو اس کتاب کے توسط سے ملا ہے، انسانوں کو ایک قومیت کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ راز جس میں ہماری بقا ہے۔

— وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا۔

" اور جو کچھ تم آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لیے بھلائی سے تم پاؤ گے اسے پاس اللہ کے وہ بہتر اور بہت بڑھ کر ہے اجر میں۔ "

(سورۃ المزمل ۔ آیت ۲۰)

(حافظ) محمد یعقوب خان، تاجیک

انجمن تحقیق و تدریس علوم و ادبیاتِ قرآن لاہور

جنوری ۱۰ ۱۹۸۷ء

طلوع اسلام لاہور (اپریل ۱۹۸۷ء)

طلوع اسلام لاہور (اپریل ۱۹۸۷ء)

نام کتاب	مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی
تالیف	محمد اشرف ظفر
ناشر	محمد اشرف ظفر پوسٹ بکس ۱۹۰۴ - لاہور ۲۵
ملنے کا پتہ	۱- محمد اشرف ظفر پوسٹ بکس ۱۹۰۴ - لاہور ۱۵
	۲- ندیم بک ہاؤس - جی پی او بکس ۱۳۳۱
	۳- کلاسیک، ۴۲ دی مال لاہور ۳ ٹیلیفون ۶۱۸۳۰ - ۳۱۲۹۷۷
	۴- طلوع اسلام ٹرسٹ - ۲۵- بی، گلبرگ ۲ - لاہور
صفحات	۵۸۴ بڑی تقطیع قیمت ۱۲۰ روپے

پاکستان کا کونسا ایسا بہی خواہ ہے جو آج یہاں کی مذہبی اور سیاسی فرقہ بندیوں سے نالاں نہ ہو کہ انہی کے سبب نہ تو پاکستانی مسلمانوں کو اُمتِ واحدہ بننے دیا اور نہ ہی ان فرقہ بندیوں نے اس ملک میں (جو خدا کے عطا فرمودہ قرآنی نظامِ حیات کے نفاذ کے لئے حاصل کیا گیا تھا) قرآنی نظامِ حیات کو نافذ ہونے دیا۔

فاضل مؤلف نے ان تمام بیماریوں پر سیر حاصل بحث کی ہے جو ملت پاکستانیہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں اور جن کا علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف میں کس قدر جگر سوزی اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اُن موضوعات سے بخوبی لگ سکتا ہے جو اس میں بطور باب دیے گئے ہیں

وہ اپنی اس علمی اور غیر جانبدار تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صحیح قرآنی تعلیم اور قرآنی نظام حیات کے اختیار کرنے سے ہی ہم وہ کچھ بن سکتے ہیں جو ہمارا خالق چاہتا ہے کہ ہم بن جائیں۔ آخر میں مؤلف ایک اپیل کی شکل میں یہ عنوان باندھتے ہیں "اِن کلیوں کو بکھرنے نہ دیجئے" اور ہر ایک سے گزارش کرتے ہیں کہ آیئے مل بیٹھ کر اپنی نئی نسل کے بچاؤ کی کوئی صورت پیدا کریں اور اس اندیشے کو کانپتے ہوئے دل کے ساتھ دہراتے ہیں کہ "کہیں یہ کلیاں حسب سابق ہماری کوتاہی کے ہاتھوں پژمردہ ہو کر ملتِ اسلامیہ کے اس اُجڑے ہوئے گلستان میں بکھر کر نہ رہ جائیں"

ہم کتاب میں شائع شدہ بزرگ صحافی مرزا ادیب کے ہمنوا ہیں کہ زندگی کے موجودہ اندھیروں میں محترم محمد اشرف ظفر صاحب کی یہ بلند پایہ تصنیف ایک شعاعِ نور ثابت ہوگی۔ کتاب کی طباعت اور جلد بندی نہایت اعلیٰ معیار کی ہے اور اسے ایک حسین گرد پوش سے مزین کیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اپنی عمر کی پونجی خرچ کر کے اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اِس مخلص اور دیانت دارانہ کاوش کو شرفِ قبولیت بخشیں۔

اس کتاب کا مطالعہ ہر درد مند انسان کے لئے جو ملت اسلامیہ کی تباہی کے اسباب جاننے اور ان کا علاج ڈھونڈھنے کی جستجو رکھتا ہو۔ نہایت مفید رہے گا۔

نام کتاب: مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی (قرآن حکیم کی روشنی میں ایک جائزہ)

ماہنامہ تعمیر انسانیت لاہور

تالیف: محمد اشرف ظفر

ملنے کا پتہ: ندیم بک ہاؤس جی پی او بکس نمبر ۱۳۳۱ پرانی انارکلی لاہور نمبر ۹

قیمت: ۱۲۰ روپے ضخامت: ۵۷۶ صفحات بڑا سائز عمدہ سفید کاغذ

نبی اکرم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جو اسلامی نظام قائم تھا اس میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی، کتاب اللہ کے احکام و اصول کو نافذ کرنے کے لئے جو طور طریق اختیار کئے گئے تھے انہیں غیر متبدل اس لئے قرار دیا گیا تھا تاکہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کتاب اللہ کے اصول و احکام کی روشنی میں امت مسلمہ جزئی قوانین بذریعہ مشاورت مرتب کر سکے۔ یہی سبب تھا کہ اس دور میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا۔ جس چیز کو غیر متبدل رہنا تھا (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر و اشاعت اور نظم و ضبط کا ہر عہد میں خصوصی اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کا دور آتا ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو خلفشار بنو امیہ کے دور میں پیدا ہوا اس نے رفتہ رفتہ بنو عباس کے دور میں ایسی صورت اختیار کر لی کہ امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ امتِ مسلمہ حنفی، شافعی حنبلی اور مالکی وغیرہ مختلف فقہی گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس فقہی گروہ بندی کے عمل اور ردعمل سے نہ جانے کتنی اور اضافی نسبتیں پیدا کر لی گئیں اب امت کا کوئی فرد صرف مسلم کے نام سے نہیں پہچانا جاتا تھا بلکہ اسے بتانا پڑتا تھا وہ کونسا مسلمان ہے۔ سنی ہے شیعہ ہے، اہلحدیث ہے، حنفی ہے، شافعی ہے، مالکی یا حنبلی ہے آگے چل کر اس دورِ ملوکیت میں منضبط ہونے والی مختلف فقہوں کے ماننے والے ہر فرقہ نے صرف اپنی فقہ اور روایات کو اسلام قرار دے لیا اور اپنے فرقہ کی فقہ روایات کے نفاذ کو اسلام کا نفاذ سمجھ لیا گیا۔ اس تکلیف دہ صورت حال سے نجات حاصل کرنے کے لئے پاکستان کا قیام بے پناہ قربانیوں کے بعد عمل میں لایا گیا تاکہ اسلام کو بطور دین نافذ کیا جا سکے۔ اور بقول اقبال "وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت و تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے" لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس مقصد عظیم سے نہ صرف یہ کہ انحراف کیا گیا بلکہ پھر اسی دور ملوکیت کے فرقہ وارانہ مذہب ہی کو اصل اسلام کے طور پر پیش کیا گیا۔ ان حالات میں مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مختلف حلقوں اور افراد کی طرف سے جو کوششیں کی جا رہی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی انہی کوششوں کی ایک کڑی ہے۔ کتاب درج ذیل اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) قرآن حکیم کی عظمت (۲) مقام فقہ (۳) کتاب و سنت (۴) مقام حدیث (۵) قرأت اختلاف (۶) ناسخ و منسوخ (۷) اسلامی آئین کی تدوین اور علمائے کرام (۸) علماء کی علمی سطح دانشوروں کی نظر میں (۹) مذہب اور دین میں فرق (۱۰) ہماری مساجد (۱۱) تصوف (۱۲) ہماری تاریخ (۱۳) عورت کی حالتِ زار (۱۴) قرآن حکیم کا معاشی نظام (۱۵) تعلیم (۱۶) قائد اعظم اور علامہ اقبال کی رفاقت (۱۷) سیاسی فرقہ بندی (۱۸) دنیا کی حالتِ زار

یوں تو کتاب کا ہر باب معلومات افزا ہے تاہم "مذہب اور دین میں فرق" "ہماری تاریخ" "عورت کی حالتِ زار" "قرآنِ حکیم کا معاشی نظام" اور "دنیا کی حالتِ زار" پر مبنی ابواب خصوصی توجہ کے مستحق ہیں ضروری نہیں کہ مؤلف کے مؤقف کی مکمل طور پر تائید کی جائے تاہم فرقہ بندی کے اسباب محرکات اور نتائج و ثمرات کو جس انداز اور کاوش سے سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر اس کا مطالعہ طالب علموں، سیاسی کارکنوں اور اسلام کو بطور دین نافذ کرنے کی تڑپ رکھنے والے تمام اشخاص کے لئے ناگزیر ہے یہ کتاب پاکستان کی ہر لائبریری میں موجود ہونی چاہیئے۔

Religious, political sectarianism

PROF. RAFI ULLAH SHEHAB

ISLAM is the religion of unity. It not only united the bickering tribes of Arabia but also established a brotherhood of all nations of the world. These nations had nothing in common except their common humanity. Islam removed all differences of colour and race and united man with man.

As a reslt of this achievement of Islam the great Muslim Ummah came into existence, which at one time of history was reckoned as the biggest political power of the world. This pleasant state of affairs, however, did not last long. With the passage of time, Muslims began to forget the teachings of Islam and their old differences of colour and race again crept up among them. In the meantime, Muslim monarchs replaced the Islamic form of government. To tighten their grip over the masses, they encouraged sectarianism. As a result, a number of religious sects came into existence.

Reformers in various periods of history tried best to revive the spirit of unity but their efforts proved futile.

P.T. 3-7-87

Worst period

When the Western powers subjugated most of the Islamic world condition of the Muslims depteriorated further. It was the worst period of their history, but instead of learning a lesson from this situation, they stuck to the evil of sectarianism. Political leaders and enlightened religious scholars tried to pull them out of this abyss but the influene of the half-educated ulema proved a great hindrance. Thus in spite of the spread of knowledge in this moden age, the evil of sectarianism persists and agitates the minds of all honest people.

Mr. Ashraf Zafar, author of *Mazhabi aur Siyasi Firqa Bandi*, is one of them. He has made a deep study of this problem and its evil effects on the unity of the Muslims and has made suggestions for its solution. This 576-page book consists of 18 chapters. Some important ones of these discuss Ijtehad, the Quran and Sunnah, the place of Hadith in Islamic literature, the Doctrine of Abrogation in the Quran, the role of Ulema in society, the difference between Deen and Mazhab, the effects of Sufism on Muslim society, the treatment of women in our society, the economic system of the Quran, the views of the Quaid-i-Azam and Allama Iqbal, and Muslims in the modern age.

The author has discussed the attitude of our half-educated ulema towards the issues faced by the Muslim Ummah. He convincingly proves that it was this attitude which resulted in religious sectarianism among the Muslims. The Ulema ignore the teachings of the Quran, he maintains, and follow their respective divines although the Quran considers any type of sectarianism a *shrik* (polytheism) which is a great sin in Islam.

In the light of this Quranic injunction, the author pleads that the Muslims should get rid of this sin as early as possible; and they can do so only by followig strictly the Quranic teachings (p. 27). In the preface, he has substantiated his claim by quotations from the speeches of the Quaid-i-Azam who wanted to eliminate sectarianism (p. 28).

The author also appreciates the efforts made by some of our ulema in this respect. It is amazing, he says, that the Ulema of different sects worked unitedly on the political front in 1977 but they were reluctant to offer prayers together even in those days (p. 73). The Muslims can unite only under the banner of the Quran, he says after discussing all these points.

The book under review is a detailed and extensive study of the problem of political and religious sectarianism faced by the Msulims in every Islamic country. It provides guidlines for those who want to eliminate this scourge from the Muslim society. Scholars as well as general readers will equally benefit by it. In view of the fact that the book contains a lot of information and enlightening discussion, it is quite cheap at Rs. 120. It is available at Nadeem Book House, 41 Old Anarkali, Lahore. (GPO Box No. 1331).

CamScanner

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

Mr.Muhammad Ashraf Zafar, in his book entitled "مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی", has brilliantly, labouriously and extensively collected material for the exposition of the disunity, created amongst the masses, by the Religious and political parties in Pakistan, resulting in what we call in the Quranic terminology "فساد فی البر والبحر" The material has been collected from Books, Pamphlets, Speeches and performances of various Religious and political leaders in the country. The author has proved beyound doubt, on the basis of Quranic verses, that the entire activity of these leaders is leading the country to a tragic end. The Holy Quran has pointed out emphatically and explicitly in the verses (3:102), (6:160), (21:53-54), (30:31-32), and (15:17), that disunity amongst a people results from the prejudices, self-interest and envy of the self-made leaders amongst them.

Mr.Zafar has proved beyond doubt, in his own particular way that political and religious parties that exist in Pakistan are a curse of the highest magnitude and a formidable obstacle in the way of establishment of an Islamic Social order in the country.

The basis of an Islamic State is the Sovereignty of the laws and injunctions laid down in the Quran, One God, the Supreme Being to whom subservience is due. In western democracy, on the other hand, Sovereignty is that of the people, which means a number of gods who control the state affairs. The Quran says: (21:22)

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ

"If there were, in the heavens and the earth, other 'gods' besides the God, there would have been disorder and confusion in both."

Cont'd Page...2...

The disorder and confusion in Pakistan is apparent. The political leaders in this country who in the Quranic terminology may be called "other gods", are "oratorical prostituutes" who stir human sentiments, not by display of body contours but by display of rosy words. Oratory is a precious human virtue but it becomes a sinful act vice when used for selfish ends. But for a few exception these "other gods" have got no political training. However, they possess sufficient money to buy the conscience of the masses. In Pakistan politics is an easily access ible vocation. Every vocation needs some sort of training. A businessman, a mason, a carpenter, a blacksmith and barber needs training before he starts his career, but our ('Qaroon') politicians responsible for nation building are an exception to it. To gain success in politics in Pakistan one needs only the following qualifications: He is capable of holding a firm grip on the mental outlook of the products of his oratory. He is capable of constantly arousing their passions, without allowing them to use their own intellect. He can create a strong impression amongst his followers that his thinking is mature and far superior to any body else's. He is well versed in the art of agitation and law-breaking. He knows how to bring about abasement to his opponents, no matter how many lies he has got to invent. He can feign strcng resistance without accepting even the truth offered by his opponents. He is capable of depicting the darkest picture of the present regime and the brightest picture of the future which he assures to bring about. He is competent to kindle the light of impossible hopes in the minds of his followers, and in order to keep this trick going, he never states any thing definite but presents his programme in the guise of attractive reforms. At every step he can firmly assure his followers that they are in the thresh-hold of success. He can keep his followers fully confident that it is only their party which is an the right path, all others are vague and unsound.

Cont'd Page..3...

He can keep them constantly on the move, without giving them respite to pause and think.

The other group responsible for the division of masses in Pakistan is that of religious and religo-political

leaders. They do not believe in the Quranic Principles and they have got no idea of the basic concepts of the Quran. Instead they believe in Ancestor worship. This behaviour on their part has a religious background. When Muslims held this reigns of power for the first time, they took guidance from the Quranic fundamentals principles, but they needed bye-laws within the four walls of these principles, for purposes of running the State. Those conversant with the teachings of the Quran gathered together and made bye-laws according to the needs of the time. Such laws were forwarded to the Judiciary for application. As the laws were initiated by the State, any addition or alteration to it was the function of the state. This is how the "fiqa' laws originated. It is apparent that there laws were changable with the changing needs of the time. They were not immutable like the fundamentals of the Quran, within the four walls of which they were framed. Neither the originators of these laws, knew the future requirements of all times to come, nor they were in the position of final authority for all future law-making. But unfortunately our religious priests have adopted the view that no further application of mind is required either for receiving guidance from the Quran or for the application of fresh bye-laws consistent with the changing needs of the time. They think that the originators of Islamic laws were the only competent persons who could think over it. Thus the Quran gradually came to be considered only, a book of highest reverence, but not a book which could be used as a source of law. This is how the Muslim Ummah became divided and subdivided into Sects.

The worst part of these happenings is that Mullaism and Mysticism have become identical. One God, One and the final code of laws laid down by Him and revealed to the

Cont'd Page...4..

last "Rasool" (peace be upon him) for the guidance of mankind is the only source which can bring the Muslim Ummah into one compact organisation, with coordinated functioning. That is Tauheed. Any thing contrary to it is 'Shirk'. Mr. Zafar has painfully collected the performance of such 'Mushrikeen' since the birth of Pakistan.

Doctor Abdul Wadood)

قیام پاکستان کا مقصد علامہ اقبالؒ کی نظر میں

"اس مملکت کے قیام سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے، اس سے نہ صرف اس کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی۔ بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء

اس سے قبل بھی انہوں نے سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں کہا تھا کہ

"ہمارے لئے کشاد کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کر دیا جائے اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔"

منفی رویّے

(بحوالہ قرآن حکیم)

A فرعونیت
B ہامانیت
C قارونیت

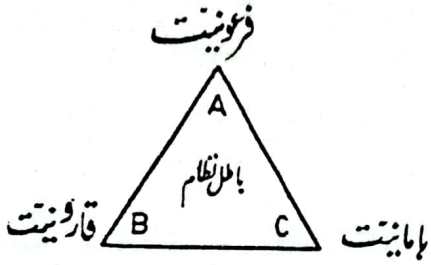

"خدا بھی کسی قوم کی خارجی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی داخلی دنیا ـــــ ذہنیت و نفسیات ـــــ میں خود تبدیلی پیدا نہ کرے"

سورۃ الرعد - آیت ۱۱

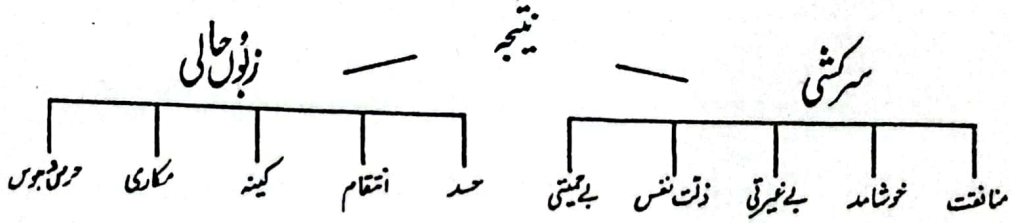

(ننگِ انسانیت)

ہلاکتِ انسان

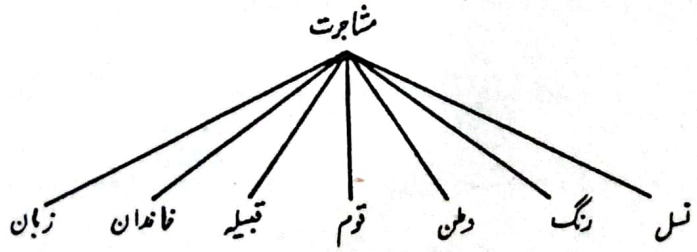

(بٹی ہوئی انسانیت)

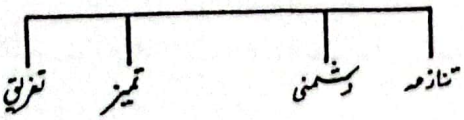

آشفتہ حالی

انجمن تحقیق و تدریس علوم و ادبیات قرآن

فہرست مشمولات

عنوان	صفحہ
پہلا باب	
قرآن حکیم کی عظمت	۳۳
• فرقہ بندی اور قرآن حکیم	۳۵
• ٹیلی ویژن پہ مذاکرہ	۳۷
• فرقہ بندی کا نتیجہ • فرقہ بندی پیدا کیسے ہوئی ؟	۳۸
• قائدِ اعظم اور فرقہ بندی	۴۰
• پاکستان کی ضرورت کیوں ؟	〃
• پاکستان میں فرقہ بندی	۴۱
• جناب مودودی (مرحوم) اور جماعت سازی	〃
• ۳۱ علماء کے ۲۲ نکات	۴۲
• جناب ارشاد احمد حقانی کی دلسوزی	۴۴
• انتخابی منشور میں سیاسی پارٹیوں کا وجود	۴۷
• سیاسی جماعتوں کا منشور • قومی اتحاد کا منشور	۴۸
• نظریاتی کونسل کا سوالنامہ	۴۹
• نظریاتی کونسل کی رپورٹ	۵۰
• جمعیت علمائے پاکستان کا انتخابی منشور	۵۳
• ڈاکٹر اسرار احمد صاحب	۵۶
• وزیر اعظم محمد خان جونیجو	۵۹
• فخر امام • قومی اسمبلی کی سیاسی کمیٹی کی رپورٹ	۶۰
• روزنامہ جنگ (لاہور) کا اداریہ	〃
• یک جماعتی نظام اور روحِ اسلام	۶۳
• نوائے وقت کی پکار	۶۴
• نظام سرمایہ داری اور انتخابات	۶۷
• جمہوریت کس طرح بحال ہو گی	۶۸
• احمد ندیم قاسمی اور بحالی جمہوریت	۶۹
• جمہوریت کے سلسلہ میں علامہ مشرقی کا فرمان	۷۰
• اصل حل • ایک مزید ثبوت	۷۱
• قومی اتحاد کی اندرونی چپقلش کے سلسلہ میں	〃
• خان محمد اشرف خان صاحب کا انٹرویو	
• ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد کی حالت	۷۷
• صدر مملکت کا بیان	〃

عنوان	صفحہ
• پنجاب اسمبلی میں گالی گلوچ	۷۸
• وزیر مذہبی امور کا بیان	〃
• مسلم لیگی قیادت کے انتخاب کا منظر	〃
• ماہ دسمبر اور جنوری ۸۹-۱۹۹۰ء کے اخبارات کی چند ایک سُرخیاں	۷۹
• ایک انتخابی حلقہ کے حالاتِ زندگی	۸۱
• نوجوان نسل کا مستقبل سیاست کی بھٹی میں	۸۲
• آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟	۸۳
• اب فوج کشی کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی	۸۴
• صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ایک میٹنگ کا حال	〃
• قوم زندہ اور تابندہ رہنا چاہتی ہے	۸۵
• بیرونی جارحیت کا خطرہ اور ہمارے سیاستدان	〃
• قصۂ پاکستان عوامی تحریک کے نام کا	۸۶
• گنبد خضریٰ کے سائے میں سیاسی جماعت کا نام	۸۷
• صبح یہ نام آقا کی بارگاہ میں پیش کریں گے	〃
• جماعت کا نام پیش کیا گیا	۸۸
• رفیق ادارہ محترمہ مسز مہاجر کا خواب	〃
• امریکی قونصل جنرل کا خراج تحسین	〃
• پروفیسر محمد منور صاحب کا مضمون	۹۳
• نظام مصطفےٰ اور کفر کے فتوے	۹۴
• فرقہ بندی اور افطاری	〃

عنوان	صفحہ
• صدر مملکت کو غلط فہمی ہوئی ہے	۹۵
• امام کیسے بناؤں؟	۹۷
• جنگ فورم میں اجتماعی نماز سے انکار	〃
دُوسرا باب	
مقامِ فقہ	۱۰۱
اجتہاد کی اہمیت اور ہماری چشم پوشی	
• مجلس شوریٰ کے صدر کی حق گوئی	〃
• جناب انوار الحق صاحب کا بیان	۱۰۲
• مفتی جعفر حسین کا انٹرویو	۱۰۴
• تحریک نفاذ فقہ جعفریہ	۱۰۵
• پھونک ڈالے گی چمن کو آتشِ بیکار	۱۰۶
• ناجائز اسلحہ کی بھرمار	〃
• ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تجویز	۱۰۷
• مولانا عبدالستار خاں نیازی صاحب کا بیان	〃
• محترمہ بے نظیر بھٹو کا پروگرام • حنفی فقہ کی حقیقت	۱۰۸
• جناب مودودی کا اعتراف	〃
• مودودی صاحب کا نقطۂ نظر بسلسلۂ اکثریت	۱۰۹
• امام ابوحنیفہ کا مسلک	۱۱۰
• علامہ اقبال کی تعلیم	〃
• پروفیسر عثمان	۱۱۱
• فقہی اختلاف کی چند ایک مثالیں	〃

عنوان	صفحہ
• فقہی اختلافات کا نتیجہ	۱۱۲
• شریعت بل کے نمایاں پہلو	۱۱۳
• جناب پیر پگارڑہ کا اظہار خیال	۱۱۴
• مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر الدین احمد کا بیان	۱۱۶
• مولانا عبدالستار خان نیازی کا بیان	״
• مصطفیٰ اعوان صاحب کا کھلا خط	״
• نفاذ شریعت بل کی مختلف دفعات	۱۱۷
• شریعت بل اور علماء مشائخ کنونشن	۱۲۱
• اجتہاد کی ضرورت نہیں	۱۲۳
• وارث میر صاحب کی بلند نگہی	״
• ڈاکٹر تنزیل الرحمان کی تجویز	۱۲۴
• صدر ایوب خاں (مرحوم) کی ایک یادگار تقریر	״
• پرویز صاحب سے حنیف رامے کا انٹرویو	۱۲۷
• علامہ اقبالؒ کے نزدیک ناموزوں ادارے کی مخالفت کی وجہ جواز	۱۳۲
• فقہ اسلامی کی تشکیل جدید پر علامہ صاحب کا اجتہاد	۱۳۴
• فقہ کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں اقبال کا قلب حساس	״
• علامہ اقبال کا تیار کردہ اجتہادی منصوبہ	״
• فقہ کی تشکیل جدید کے متعلق قائد اعظم کی خواہش	۱۳۶

عنوان	صفحہ
تیسرا باب — **کتاب و سنّت**	۱۳۸
• ملکی قانون	״
• مختلف منشوروں میں کتاب و سنت کا ذکر	״
• مودودی صاحب کا اعتراف	۱۳۹
• اس اعتراف کے باوجود	״
• صدارتی حکم — ایک اہم سوالنامہ	״
چوتھا باب — **مقام احادیث**	۲۴۲
• احادیث کس طرح جمع ہوئیں	״
• اہل حدیث کا نظریہ	״
• کفر کا فتویٰ	۱۴۳
• حنفی حدیثیں • قرآن کا حنفی ترجمہ	۱۴۴
• فرقہ اہل سنت والجماعت کے لئے تفسیر	۱۴۵
• رجم کی سزا	۱۴۶
• سنگساری کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ کا اداریہ	۱۴۷
• بدکاری کے جرم میں سنگساری کا حکم	״
• وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ	۱۴۸

عنوان	صفحہ
پانچواں باب	
قرات کا اختلاف	۱۴۹
• مودودی صاحب مرحوم کا موقف	//
• جناب تمنا عمادی صاحب	//
• اس کے باوجود	۱۵۰
• یہ اعراب اور نقاط کس نے لگائے	//
• اعراب کا فائدہ	۱۵۱
• اعراب وغیرہ کے بغیر نقصان	۱۵۲
• خدا تعالےٰ کو بھی احساس نہ تھا	۱۵۳
• ہمارا نصاب تعلیم	۱۵۴
• قرآن حکیم کی تدوین	//
• صاحب نصاب حضرات	//
• چند ایک اہم سوالات	۱۵۵
• ایک گزارش	۱۵۶
چھٹا باب	
ناسخ و منسوخ	۱۵۷
• تدریجی مراحل کے مطابق راہنمائی	//
• قرآنی احکام منسوخ نہیں ہوا کرتے	۱۵۸
• پرویز صاحب کا ارشاد	//

عنوان	صفحہ
ساتواں باب	
اسلامی آئین کی تدوین اور علمائے کرام	۱۶۰
• قانون کی اہمیت	//
• پیر محمد اشرف صاحب کا انٹرویو	//
• صدر ایوب کی کوشش	۱۶۱
• صدر ایوب کی پیشکش	۱۶۲
• آئین کی تدوین کے سلسلہ میں صدر ضیاء الحق کا بیان	۱۶۳
• جناب چیف جسٹس کی اپیل	//
• سردار قیوم کا انٹرویو	۱۶۴
• علماء کے ۲۲ نکات اور فرقہ بندی	//
• نظر و فکر (جامعہ نعیمیہ) گڑھی شاہو لاہور	۱۶۵
• یورپ کی اسلامی کونسل	۱۶۷
• علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت	//
• طلوع اسلام کا تبصرہ • مزید وضاحت	۱۶۸
• ملوکیت کا علاج	//
آٹھواں باب	
علماء کی علمی سطح دانشوروں کی نظر میں	۱۷۰
• جناب فاروقی صاحب سے انٹرویو	//
• علامہ اقبال کی سوچ	۱۷۱

عنوان	صفحہ
• آغا شورش کاشمیری اور علمائے کرام	۱۷۲
• سیرت کی محفلیں، علماء اور سامعین	″
• ارشاد احمد حقانی صاحب اور علمائے کرام	۱۷۳
• مسٹر جسٹس قدیر الدین احمد کا بیان	۱۷۴
• علماء کا مطالبہ اور ان کا الٹی میٹم	۱۷۵
• عدالت کی تحقیقاتی رپورٹ	″
• ملیچھوں کے سے سلوک پر بھی اعتراض نہیں	۱۷۶
نواں باب	
مذہب اور دین میں فرق	۱۷۸
• تقابلی جائزہ	″
• مذہب کا مدار لالچ اور خوف پر ہوتا ہے	۱۸۰
• ایک سبق آموز حقیقی داستان	۱۸۱
• آج کا پاکستان	۱۸۷
• مذہبی ماحول کے پروردہ نوجوانوں کی نفسیاتی حالت	۱۸۸
• خوف کے پیدا کردہ امراض	۱۸۹
• ظہور اسلام کے وقت انسانیت کی حالت	۱۹۰
• ہم نے یہ باور ہی نہ ہونے دیا	۱۹۱
• خارجی کائنات میں قانون کی حکمرانی	″
• اس زبوں حالی کا علاج	۱۹۲
دسواں باب	
ہماری مساجد	۱۹۳

عنوان	صفحہ
• لاؤڈ سپیکر کا استعمال	۱۹۳
• لاؤڈ سپیکر کی جگہ مائیک	″
• مساجد کی قرار دادیں	۱۹۴
• تھیاکریسی کی تعریف	″
• مساجد میں ہاتھا پائی	۱۹۵
• ختم نبوت پر ہنگامہ	۱۹۶
• یارسول اللہ اور رسول اللہ کا نفرنسیں	۱۹۷
• اوقاف کا شعبہ الگ کر دیں	۱۹۸
• مطالبات	″
• پابندی کے باوجود • جناب م۔ش	۱۹۹
• وارث میر صاحب	″
• ارشاد احمد حقانی صاحب	۲۰۰
• جنرل ضیاء الحق صاحب کی اپیل	″
• راجہ ظفر الحق (سابق) وزیر اطلاعات	۲۰۱
• علماء کمیٹی کا تجویز کردہ علاج	″
• حافظ ربیر احمد ظہیر صاحب کا اعتراف	″
• بیرون ملک کی مساجد میں ہنگامے	۲۰۲
• ایک صاحب دردِ دل کی پکار	۲۰۳
• حج کا فلسفہ • تمدنی زندگی کی ابتداء	۲۰۵
• انبیاء کی بعثت کا مقصد	۲۰۶
• للناس کا مقصد	۲۰۷
• نیشنل ازم کی تباہ کاریاں • جائے امن	۲۰۸

عنوان	صفحہ
• نوعِ انسانی کی امامت	۲۱۰
• مشاورت اور صلوٰۃ کا باہمی ربط	۲۱۱
• "حج" الناس کے لئے ہے	"
• حجِ اسلام	۲۱۲
• نوعِ انسانی کی منفعت	۲۱۳
• ہمارا حج	۲۱۴
• آج کا مسلمان	۲۱۵
• جناب حقانی صاحب کا سفرِ حج	۲۱۷
• معلمین کی ہوسِ زر	"
• زور آور حاجی	۲۱۸
گیارہواں باب	
تصوّف	۲۱۹
• ایک ضروری گذارش • وحی کی راہنمائی	"
• نبوّت کا فریضہ	۲۲۰
• مقامِ بصیرت • کتاب و حکمت	۲۲۱
• مولانا روم	۲۲۲
• شیخ اکبر	۲۲۳
• مولانا رومی • علامہ اقبال	۲۲۴
• باطنی علم کے خلاف	۲۲۵
• تصوف کا دوسرا بنیادی ستون یعنی (وحدت الوجود)	۲۲۶
ابن عربی کا عقیدہ	۲۲۷

عنوان	صفحہ
• مولانا روم کا فرمان	۲۲۷
• بُلھے شاہ	۲۲۸
• خواجہ غلام فرید - شاہ حسین	۲۲۹
• غالبؔ	۲۳۰
• وجودی مذہب آیا کہاں سے؟	"
• گہری سازش	"
• شعرائے عجم • حافظ شیرازی کی مخالفت	۲۳۱
• وجودی مذہب کی حقیقت	
• صوفی شعراء کا عمل	۲۳۲
• تصوف اور انسانی روح (وحدت الوجود کی دوسری شاخ)	"
• زندگی کی اصل حقیقت	۲۳۳
• مادیت تصوف کی نظر میں	۲۳۵
• صدائے اقبال	۲۳۶
• ادارہ منہاج القرآن اور تصوّف	۲۳۷
• رسول خداؐ نے مجھے بشارت دی ہے	۲۳۸
• ذکر کچھ مخلص لوگوں کا	"
• علامہ کی صحت اور تصوّف	۲۳۹
• اقبال کا قلبی جہاد	۲۴۱
• ابلیس کی مجلس شوریٰ	۲۴۲
• مروجہ اسلام و تصوف	۲۴۳
• اس کے اثرات	۲۴۴

عنوان	صفحہ
• ہندو اور تصوف جی ایم سید	۲۴۵
بارہواں باب	
ہماری تاریخ	۲۴۷
• تاریخ کی اہمیت	//
• صحابہؓ کا مقام	۲۴۸
• ہماری تاریخ کی حالت	۲۵۰
• مودودی صاحب کا بیان	//
• حضرت عباسؓ کا بیان	۲۵۱
• حضرت حبابؓ کی تقریر	۲۵۲
• حضرت عمر فاروقؓ کا بیان	//
• حضرت حبابؓ کا جواب	۲۵۳
• پھر آپس کی تکرار	//
• انصار اور مہاجرین کے باہمی تعلقات	۲۵۴
• عہد جاہلیت کا منظر	۲۵۵
• مقام اہل بیت ۔ تاریخ کی نظر میں	//
• حضرت علیؓ کا انکار	۲۵۶
• ہماری حالت زار	۲۵۷
• آخری علاج	۲۵۸
تیرہواں باب	
عورت کی حالت زار اور ہم	۲۵۹
• اللہ تعالےٰ نے فرمایا	۲۶۰

عنوان	صفحہ
• مولانا نعمت اللہ خاں صاحب	۲۶۲
• طلوعِ اسلام کا تبصرہ	//
• جناب مودودی صاحب مرحوم	//
• لونڈیوں کو فروخت کرنے کی اجازت ہے	۲۶۳
• لونڈیوں کی تعداد پر بھی کوئی پابندی نہیں	//
• کوئی غلام مرد یا لونڈی اسلام قبول کرنے کے بعد آزاد نہیں ہو سکتی	//
• جنت کی حوریں کون ؟	۲۶۴
• مودودی صاحب (مرحوم) کا نوٹس	//
• لونڈی کے بعد بیوی	۲۶۵
• جناب ظفر احمد انصاری صاحب کا بیان	//
• آہ بیچاری عورت !	۲۶۷
• چار چار بیویوں کے لئے مفتی محمود (مرحوم) کا فتویٰ	//
• مرد ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتا	۲۶۸
• ایک غریب اپنی جسمانی ضرورت کس طرح پوری کریگا	۲۶۹
• یہ غلط فہمی پر مبنی ہے	//
• صغیرہ اسلام کی حق گوئی	//
• ماہرین کی رائے	۲۷۰
• حمیرا ہاشمی	//
• باہمی نوک جھوک	//
• ڈاکٹر انون کی ریسرچ	۲۷۱
• لیکن اس کے برعکس	۲۷۲
• فرائڈ کی تحقیق	۲۷۳

عنوان	صفحہ
• جناب پرویز کی قرآنی بصیرت	۲۷۳
• تین گروہ	۲۷۴
• جنسی بدنہادی کے نتائج	۲۷۵
• پرویز صاحب کا تبصرہ	۲۷۶
• مثالی تمدن کی حامل قوم	//
• کیا ضبط نفس ممکن ہے ؟	۲۷۷
• خیال کا دخل	۲۷۸
• ضبطِ نفس کا قرآنی حکم	//
• لیکن مودودی صاحب کی تعلیم	۲۷۹
• شادیوں کے سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت غیر مسلموں کی نظر میں	۲۸۰
• قرآنی راہنمائی • ہنگامی حالات	۲۸۱
• بیویوں کی اجازت	۲۸۳
• عائلی قوانین کی بحث	۲۸۵
• جماعت اسلامی اور عائلی قوانین	۲۸۶
• عائلی قوانین وارث میر کی نظر میں	۲۸۷
• اسمبلی میں پیش کردہ تحریک	۲۸۸
• قصہ عورت کی سربراہی کا	۲۹۱
• علماء کنونشن کا احتجاج	//
• ڈاکٹر اسرار احمد اور ڈاکٹر طاہر القادری کا ارشاد	//
• مفتی اعظم سعودی عرب کا فتویٰ	۲۹۲
• جامعہ الازہر کے علماء کا فتویٰ	۲۹۳
• عورت کی سربراہی پر احمد ندیم قاسمی کا تبصرہ	۲۹۴
• صدر غلام اسحاق کا بیان	//

عنوان	صفحہ
• جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کا تبصرہ	۲۹۵
• مولانا کوثر نیازی صاحب کا خط مودودی صاحب کے نام	۲۹۶
• ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔	//
• سو حرمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا	۲۹۷
• کوثر نیازی صاحب کا خود اپنے بارے میں اظہار خیال	۲۹۸
• ایک چہرے پر کئی چہرے	۲۹۹
• ہماری دینی اور اصلاحی دعوت پر کوئی اعتماد نہیں کر سکتا	۳۰۰
• تضاد عملی کے چند پہلو	//
• محمد علی فاروق کی قرآن فہمی	۳۰۲
• بخاری شریف میں تصویر بنانے سے بھی منع کیا گیا ہے	//
• تو پھر عورت کی سربراہی والی اور تصویر والی حدیث میں فرق کیوں ہے ؟	۳۰۳
• امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے۔	۳۰۴
• حاصل کلام	۳۰۶
• عورت اور پردہ	۳۰۷
• سرحد اسمبلی کی قرارداد	//
• پردہ اور قرآنی حکم	۳۱۰
• ڈاکٹر خالدہ ترین کا تجزیہ	۳۱۳
• عورت کی دیت	۳۱۴
• اہل عرب کے اساتذہ	//

عنوان	صفحہ
• مولانا عبدالستار خاں نیازی کی اپیل	۳۱۶
• علماء کرام کا فتویٰ	〃
• ارشاد احمد حقانی صاحب کی پکار	۳۱۸
• ایسا ہونے نہیں دیا جائے گا	۳۱۹
• عورت کی خرید و فروخت	〃
• پاکستان میں عورت کا معاشرتی مقام	۳۲۰
• مزید تصویر کشی	۳۲۱
• مغرب میں عورت کی حالت	〃
• خوف و حزن کی تباہ کاریاں	۳۲۲
• ہمارے مہذب معاشرے کی حالت	۳۲۴
• یہ سب کچھ کیا ہے ؟	۳۲۵
• اس سے بھی آگے	〃
• عورت کی برہنگی	۳۲۶
• جنگ کا اداریہ	〃
• جناب منیر احمد صاحب کا دردِ دل	〃
• حرفِ آخر اور علاج	۳۲۷
• وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ	۳۲۸
• تصویر کا دوسرا رخ	۳۲۹
• وصفی روایات کے تحت نئی نسل کو دی جانے والی تعلیم	〃
• حسن سلوک اور عورت کی پیدائش	〃
چودھواں باب	
قرآن حکیم کا معاشی نظام	۳۳۰

عنوان	صفحہ
• ربوٰا کی قرآنی تعلیم	۳۳۰
• سود سے بچنے کا حیلہ	〃
• امام یوسف کا مسلک	۳۳۱
• پروفیسر طاہر القادری اور نظامِ سود	〃
• احمد رضا خاں بریلوی	〃
• ایک سبق آموز مثال	۳۳۲
• متضاد نظریات کا نتیجہ	۳۳۳
• طلوعِ اسلام اور ربوٰا	۳۳۴
• تجارت کا منافع	〃
• ربوٰا حرام بھی ہے اور حلال بھی	۳۳۵
• علامہ اقبال اور زمینداری نظام ڈاکٹر اسرار احمد کی نظر میں	〃
• طلوعِ اسلام کا تبصرہ	۳۳۷
• ارشاد احمد حقانی صاحب جماعت اسلامی اور معاشی نظام	〃
• جماعت کما حقہٗ ادراک نہیں رکھتی	۳۳۸
• جماعت اسلامی اور دنیائے عرب	۲۳۹
• وزارت مالیات کی رپورٹ	〃
• کیا پرائیویٹ پراپرٹی جائز ہے؟	۳۴۰
• یہ شیخ چلی کی باتیں ہیں	۳۴۱
• اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا تصور کو حل نہیں	〃
• ربوٰا کس طرح ختم ہو سکتا ہے ؟	۳۴۲
• اسلامی معاشی اصلاحات کے اصول اور مقرر کردہ کمیٹی کی رپورٹ	۳۴۳

عنوان	صفحہ
• ایک خلش کا ازالہ	۳۴۵
• زکوٰۃ لی نہیں جاتی بلکہ دی جاتی ہے	۳۴۶
• ہمارا نصاب تعلیم اور زکوٰۃ	۳۴۷
• زکوٰۃ اور مسائل زکوٰۃ	〃
• مرے کو مارے شاہ مدار	۳۴۸
• انسائیکلو پیڈیا میں زکوٰۃ کا پیش کردہ مفہوم	〃
• دولت جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں	۳۴۹
• مودودی صاحب کے نزدیک زکوٰۃ کا تصور	۳۵۰
• مال جمع کرنے پر صحابہ کرامؓ کی تشویش اور اس کا حل	〃
• دیگر ملکی علماء کا تصور زکوٰۃ	۳۵۱
• ۱۹۵۰ء میں قائم ہونے والی کمیٹی کی رپورٹ	۳۵۲
• زکوٰۃ کمیٹیوں کا قیام اور زکوٰۃ فنڈ کا مصرف	۳۵۳
• زکوٰۃ کی رقم سے کاروں اور کوٹھیوں کی خرید	〃
• مدبر جنگ کی نظر میں زکوٰۃ کے مفہوم کی ایک جھلک	۳۵۵
	〃
• بنیادی صنعتوں کے متعلق قائداعظم کا فرمان	〃
• معاشی نظام کے سلسلہ میں احمد ندیم قاسمی کی قرآنی فکر	۳۵۶
• قرآنی معاشی نظام کی بنیاد "فائدہ" پر نہیں افادہ پر ہے	〃
• افسوس عملی تبدیلی کے لئے کوئی تیار نہ ہوا	〃
• مقتدر طبقات اور قومی وسائل	۳۵۷
• نظام سرمایہ داری اور ماہنامہ تعمیر انسانیت	۳۵۹

عنوان	صفحہ
• چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس محمد حسین بہشتی مرحوم	۳۶۲
• علامہ غلام احمد پرویز "مرحوم" کا ارشاد	۳۶۳
• ذہن کو ہر ایک کے لئے کھلا رکھو	〃
• کمیونزم کے پاس کوئی حل نہیں	۳۶۴
• قرآن کا معاشی نظام اور مساوات محمدیؐ	۳۶۵
• کیفیت کی یکسانیت	۳۶۶
• علامہ اقبال اور روٹی کا مسئلہ	۳۶۸
• قائداعظم اور سرمایہ دار	〃
پندرہواں باب **تعلیم**	۳۷۰
• ارشاد قائداعظم	〃
• حصول آزادی کی قیمت	〃
• نظریاتی مملکت کا حصول	〃
• علامہ اقبال اور زوالِ داستان	۳۷۱
• نظریاتی مملکت کے تحفظ کا علاج	۳۷۲
• صدر ایوب مرحوم کی نگاہ بصیرت	〃
• ٹیکنالوجی کی اہمیت اور ہم	۳۷۳
• یونیورسٹیوں کی حالت	۳۷۴
• صدر غلام اسحاق خاں صاحب کا بیان	۳۷۵
• ٹیکنالوجی کے لئے فنڈ	〃
• خواندگی کا تناسب	۳۷۶

عنوان	صفحہ
• وفاقی وزیر تعلیم کا بیان	۳۷۶
• جنگ فورم اور مجلس مذاکرہ	۳۷۷
• جونیئر کلرک کی اسامی کے لئے گیارہ ڈیل ایم اے امیدوار	″
• نوجوانوں کے مسائل	۳۷۸
• خود اختسابی کی درخشاں مثال	″
• ایک طالب علم کا خط بسلسلہ سیاسی جماعتیں اور طلبہ	۳۸۰
• نظریاتی تعلیم کا فقدان	۳۸۲
• بی اے کی اسلامیات کا نصاب جدید	″
• بی اے کے لئے حریری صاحب کی دوسری کتاب "تفسیر قرآن"	۳۸۳
• مقام عورت	۳۸۴
• نماز کی ادائیگی اور تضادات	″
• کیا قرآن حکیم کا ترجمہ ممکن ہے؟	۳۸۵
• وحی کی زبان کی اہمیت	۳۸۶
• ترجمہ کرنے کا نتیجہ	″
• حسد کا مفہوم	۳۸۷
• خون کو ٹھنڈا رکھنے کا طریق	۳۸۸
• جنت کس طرح حاصل ہوگی؟	۳۸۹
• ایک اور اہمیت	۳۹۰
• مورس بکائے کی حق گوئی	″
• قرآن اور سائنس	۳۹۱
• تراجم غلط کیوں ہیں؟	

عنوان	صفحہ
• قرآن اور کائنات	۳۹۲
• پہلے پوری کائنات ایک ہیولیٰ تھی	۳۹۳
• ارض وسماوات کا بیان	″
• کائنات کی وسعت	۳۹۴
• ہمارے ہاں کی تعلیم	۳۹۷
• عرش کا بیان	″
• حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مخلوق خدا اور ابلیس	۳۹۸
• کوئی پیغمبر زندہ رہنے والا نہ تھا	″
• وَرَافِعُكَ کا مفہوم	۳۹۹
• لیکن اس کے باوجود آنے والے کا عقیدہ	″
• یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی؟	۴۰۰
• ختم نبوت کی حقیقت	۴۰۱
• مذہبی درسگاہوں کے نصاب کے متعلق حکومت کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ	۴۰۲
• انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد	۴۰۳
• انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کا ایک اور خطبہ	۴۰۷
• خطبے کا اقتباس	۴۰۸
• ہم تو مائل بہ کرم ہیں	۴۱۴
• ان کلیوں کو بکھرنے نہ دیجئے	″
• مستبد قوتوں کے مختلف حربے	″
• صدر ایوب کی پکار	۴۱۵
• فنڈ امینٹل ازم	۴۱۶

عنوان	صفحہ
• فنڈمینٹل ازم امت کی تباہی کی انتہائی خطرناک سکیم	۴۱۶
• فنڈمینٹل ازم کے عملی نتائج	۴۱۸
• مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن	۴۱۹
• ڈاکٹر اسرار احمد کا تنظیمی پروگرام	۴۲۱
• طلوعِ اسلام کا تبصرہ	۴۲۳
• فضلات مبارکہ اور جسم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۴۲۴
• استنجے کے پتھر مسجد میں لانا	۴۲۵
• قصہ آدم کی پیدائش کا	۴۲۶
• شجر سے کیا مراد تھا	۴۳۱
• قصہ آدم اقبال کی نظر میں	۴۳۴
• لفظ آدم کی وضاحت	۴۳۵
• قصہ آدم علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی نظر میں	۴۳۷
• مقام انسان اور کائنات کی ماہیت	۴۳۸
• آدم کا لفظ نسل انسانی کیلئے استعمال ہوا ہے	۴۳۹
• قرآن حکیم کو سمجھنے کا قرآنی طریق	۴۴۰
• ڈاکٹر سید عبدالودود اور قصہ آدم	//
• لفظ ملائکہ کی تشریح اور وضاحت	۴۴۲
• ملائکہ چھپی ہوئی قوتیں ہیں	۴۴۸
• پروفیسر وارث میر کے نام خط	۴۵۰
• عورت کی پیدائش	۴۵۴
• مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کا بیان	//
سولھواں باب	
قائداعظم اور علامہ اقبال کی رفاقت	۴۶۰

عنوان	صفحہ
• قائداعظم علامہ اقبال کی نظر میں	۴۶۰
• میں تو مسٹر جناح کا ایک معمولی سپاہی ہوں	//
• علامہ اقبال کے متعلق قائداعظم کا فرمان	۴۶۱
• رفاقت کی اصل وجہ	۴۶۳
• ایک دردِ دل کی پکار	//
سترہواں باب	
پاکستان کے سابقہ حکمران کردار کے آئینہ میں	۴۶۵
• ارشاد خداوندی	//
• مسٹر غلام محمد کی شخصیت	۴۶۶
• صدر ایوب کی ذات وصفات	۴۶۷
• یحییٰ خاں کی کہانی	۴۶۸
• صدر سکندر مرزا اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب	۴۶۹
• صدر ضیاء الحق کے مارشل لاء دور پر پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق کا تبصرہ	۴۷۰
• مسٹر جسٹس جاوید اقبال کا تبصرہ	۴۷۲
• تحریک استقلال کے جنرل سیکرٹری کا بیان	//
• ضیاء الحق کی قرآن فہمی کے متعلق ڈاکٹر عبدالودود کا بیان	۴۷۳
• صدر اسلامائزیشن پر حقانی صاحب کا تبصرہ	//
• نہ زرعی اصلاحات کی ضرورت ہے نہ زرعی ٹیکس لگانے کا کوئی جواز	۴۷۴
• میں پرویز صاحب کے خیالات اور نظریات سے متاثر نہیں ہوا	//
• امیر جماعت اسلامی کا تبصرہ	//

عنوان	صفحہ
• جناب احمد ندیم قاسمی کا تبصرہ	۴۷۵
• خزانے کی حالت کے متعلق نوائے وقت کا اداریہ	۴۷۶
• صدر ضیاء الحق کی حکومت کے متعلق دو سو دانشوروں کے اجلاس میں منظور ہونیوالی قرارداد	//
• منظور ہونے والی قرارداد	۴۷۷
• جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا اظہار خیال	۴۸۰
• قرارداد مقاصد نظریہ پاکستان تک	//
• اسلام اور ملک سے بغاوت	۴۸۲
• مارشلائی اسلام کے اثرات	//
• جناب صدر غلام اسحاق صاحب کا بیان	//
• بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کا ذکر	۴۸۳ اے
• نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ سوچ	۴۸۳ ڈی
اٹھارہواں باب	
سیاسی فرقہ بندی	۴۸۴
• جواہر لال نہرو • ہندوستان ٹائمز	//
• مسٹر گاندھی	۴۸۵
• پٹیل • ڈاکٹر شیام پرشاد	۴۸۶
• پنڈت جواہر لال نہرو • وزیر اعظم لارڈ ایٹلی • لال بہادر شاستری	۴۸۷
• پاکستان بننے کے بعد • انگریز بیوروکریسی اور ہندو	۴۸۸
• بال ٹھاکرے • رام منوہر لوہیاہ	۴۸۹
• ایس کے موجمدار • اندرا گاندھی	۴۹۰
• مہندر پرتاب • مسٹر مہاجن • مسٹر چون	۴۹۱

عنوان	صفحہ
• پروفیسر رام دیو • اندرا گاندھی	۴۹۲
• مسٹر ستیہ مورتی • مسٹر منشی	۴۹۳
• ڈاکٹر شیام پرشاد • وارد ھارام سیکیم • لالی بہادر شاستری	۴۹۴
• تاشقند کا چناؤ	۴۹۵
• آج کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار قائداعظم کا انکشاف	۴۹۶ //
• مسٹر شکلا وزیر اعلیٰ سی پی	//
• مہاسبھا کا مشورہ • بال ٹھاکرے	۴۹۷
• ابراہیم سلیمان سیٹھ کا انٹرویو	//
• ڈاکٹر خلیق انجم	۴۹۸
• بھارت کی طرف سے پاک فوج مفلوج کرنے کا حربہ	۴۹۹
• مسلمان نوجوان لڑکیوں سے بہیمانہ سلوک	//
• ہندو کا ہندو سے سلوک	۵۰۰
• ہندو مت کے اصول زندگی	۵۰۱
• شاستری کی شخصیت	۵۰۲
• ہندو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نظر میں	//
• قائداعظم کا تبصرہ	۵۰۳
• قائداعظم کی شخصیت	۵۰۴
• پاکستان اسلام کا بنیادی تقاضا	//
• اسلام اور ہندو دھرم میں فرق	//
• مزید وضاحت • پہلا پاکستانی	۵۰۵
• مسلمان ایک الگ قوم ہے	۵۰۶

عنوان	صفحہ
• ایک مرکز نہیں ہو سکتا	۵۰۶
• قائداعظم کی پیپا کاتہ وضاحت	۵۰۷
• ہماری روح کو فنا نہیں کیا جا سکتا	//
• ہمارا کوئی دوست نہیں	۵۰۸
• امریکہ چین اور نہرو	//
• برطانیہ کی حکمرانی نہ بھارت کی	۵۰۹
• لارڈ ماونٹ بیٹن کا مقصد اور جناح کی استقامت	۵۰۹
• قائد کا کریکٹر	۵۱۰
• برطانیہ کی خواہش	۵۱۱
• پاکستان ہمارا جز ایمانی ہے	//
• قرآن ہمارا ضابطہ ہے	۵۱۵
• اسلام ایک مکمل دین ہے	//
• ہندو کو بھی یہ اعتراف تھا	۵۱۶
• ہماری نجات کا واحد راستہ	۵۱۷
• علامہ اقبال کا خط جناح کے نام	۵۱۸
• قائداعظم کے دردِ دل کی آواز	//
• قائداعظم کی جرأت و بے باکی • گاندھی کے خلاف	۵۱۹
• اصول پرستی کی خاطر اقتدار کی قربانی	۵۲۰
• قائداعظم۔ دوسروں کی نظر میں	//
• لارڈ ماؤنٹ بیٹن	//
• وزیر اعظم برطانیہ سر ونسٹن چرچل	۵۲۱
• لارڈ برٹرینڈ رسل • آغا خاں	//
• مسٹر گاندھی • سروجنی نائیڈو	۵۲۲
• ایران کے سفیر آقائے علی اصغر	//

عنوان	صفحہ
• لکشمی پنڈت • مسٹر گوکھلے	۵۲۳
• ڈاکٹر سیتلے	//
• مسٹر گاندھی • مسولینی	۵۲۴
• ابوالکلام آزاد • راج گوپال • لنڈن ٹائمز	//
• پروفیسر ڈاکٹر کراہنن	۵۲۵
• مذہب کی پبلسٹی سے گریز	//
• دھاندلی کی بجائے ہارنا بہتر	//
• احساس ذمہ داری	۵۲۶
• گورنر جنرل کے منصب کا خیال	//
• قائداعظم کی ظرافت پسندی	۵۲۷
• قائداعظم کے آخری دستخط	
• قائداعظم کے آنسو	۵۲۸
• اپنے عوام پر اعتماد	//
• علامہ سلیمان ندوی • تصویر کا دوسرا رخ	۵۳۰
• حقیقت کو تسلیم کرنے کا نتیجہ	
• ہندوستان ٹائمز کی جرأت	۵۳۱
• ہندو کی عیار سیاست اور مولانا آزاد • تقسیم کے بعد	۵۳۲
• گاندھی کی بیعت سے پہلے	۵۳۳
• قائداعظم کا تار بنام مولانا آزاد	//
• جوش ملیح آبادی	۵۳۴
• مولانا حسین احمد مدنی مرحوم	//
• مدنی صاحب کا خط بنام شوکت علی صاحب	۵۳۵
• مدنی صاحب کا صدارتی خطبہ	۵۳۶
• مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب	//

عنوان	صفحہ
• مفتی محمود صاحب	۵۳۷
• مفتی محمود صاحب کے صاحبزادہ صاحب	//
• مولانا سراج احمد دین پوری صاحب	۵۳۸
• علمائے دیوبند نے کوئی کوشش نہیں کی	//
• مجلس احرار کی قرارداد	۵۳۹
• مولانا مظہر علی اظہر	//
• مولانا نورانی کا فرقہ • مولانا اولادِ رسول	//
• مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا بیان قائداعظم کے متعلق	۵۴۰
• ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا بیان	۵۴۱
• اداریہ نوائے وقت	//
• نوائے وقت کا ایک اور اداریہ	//
• قائدِاعظم اسلامی طرزِ فکر سے عاری تھے	۵۴۳
• قائدِاعظم کے متعلق مودودی صاحب کے مزید ارشادات	۵۴۵
• ہمارا اصل مقصد	۵۴۶
• انقلاب چین کے رہنما کا تجزیہ	۵۴۷
• لیکن مودودی صاحب کا نقطۂ نظر	//
• لیکن اس کے برعکس یہ بھی	//
• سب سے زیادہ احترام • اقلیتی صوبوں میں نفرت	۵۴۸
• فوج میں بھرتی کی ممانعت	//
• جہاد کشمیر حرام ہے	//
• نوائے وقت کا اداریہ • یہ محاذ آرائی کیوں	۵۴۹
• میاں صاحب کا ایک اور بیان	۵۵۰

عنوان	صفحہ
• اقتدار حاصل کرنے کا طریق	۵۵۰
• جھوٹ بولنے کی اجازت	//
• پاکستان ہم نے بنایا	۵۵۱
• سرحد میں ریفرنڈم	۵۵۲
• ایشیا کا دعویٰ	//
• تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ	۵۵۳
• جناب عثمان لمان صاحب کا احتجاج	//
• مودودی صاحب کا اخلاق	۵۵۴
• خطیب جامعہ مسجد لبرٹی مارکیٹ لاہور اور قائداعظم	۵۵۵
• نیشنلسٹ علماء کی تاریخ پاکستان سے علیحدگی	۵۵۶
• ارزاں فروشی کی انتہا	۵۵۷
• بورڈ سے علیحدگی	//
• مسلمانوں کی ذہنی پستی کے متعلق قائداعظم کا ارشاد	۵۵۸
• قائداعظم اور علماء کرام	//
• تھیاکریسی نہیں ہوگی	۵۵۹
• قائداعظم اور قرآن	//
• مسلم لیگ کا کارنامہ	۵۶۰
• ملوکیت اور علامہ اقبالؒ	//
• احبار و رہبان اور انجیل	۵۶۱
• قرآنِ حکیم کی بشارت	۵۶۲
• کیبنٹ مشن پلان کی حقیقت	//

عنوان	صفحہ
• قائد کی کہانی فاطمہ جناح کی زبانی	۵۶۵
• قائدِ اعظم کے سفرِ آخرت کی روئیداد	۵۶۶
• قائدِ اعظم کی وصیت	۵۶۹
• صوبائی تفریق اور اس کے نتائج	۵۷۰
• اِس بُعد کا واحد حل	//
• صوبوں کی جغرافیائی حقیقت	۵۷۱
• وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کی تقریر	//
• طلوعِ اسلام کا تبصرہ	۵۷۲
• ون یونٹ کے بعد انتظامی اسقام کا نتیجہ	۵۷۳
• اُلٹا علاج	۵۷۴
• ون یونٹ کا خاتمہ اور پانی کی تقسیم کا مسئلہ	//
• وزیرِ اعلیٰ سندھ کا بیان	۵۷۵
• عبدالحمید جتوئی	//
• سقوطِ ڈھاکہ	۵۷۷
• وزیرِ اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کا بیان	//
• نذرالاسلام کا فرمان	۵۷۸
• شیخ مجیب الرحمان (صدر بنگلہ دیش کا بیان)	//
• ڈاکٹر کمال حسین مورتیوں کے چرنوں میں	//
• آئیڈیالوجی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ	۵۷۹
• ہمایوں کبیر کی بیٹی کا حقیقت کشا بیان	۵۸۰
• سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہاں کے حالات	۵۸۲
• آخر کار ظہورِ نتائج کا وقت آ پہنچا	۵۸۴
• آخر کار بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا	۵۸۵
• قائدِ اعظم کی مومنانہ فراست باقی ماندہ پاکستان	۵۸۷

عنوان	صفحہ
• یہ فقرہ چند بچوں نے لگایا تھا	۵۸۸
• پاکستان کے نامور مشاہیر کا ٹی وی پروگرام	//
• شیخ رشید صاحب کا بیان	۵۸۹
• جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کی تحریر	//
• اداریہ نوائے وقت • مودودی صاحب کا اپنا بیان	۵۹۲
• یہ تو تحریر کے آغاز سے ہی واضح تھا	۵۹۳
• قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر اور اس کی وضاحت از پرویز صاحب	۵۹۴
• ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی حالت	۵۹۶
• اس یقین دہانی کی اصل وجہ	۵۹۷
• اس تقریر کا مفہوم خود غیروں کی نظر میں	//
• اگست ۱۹۴۷ء کے بعد	۵۹۸
• پاکستان کا مقصد صرف ایک ٹکڑا زمین کا حصول نہ تھا	//
• رفیق احمد باجوہ صاحب کا بیان	۵۹۹
• مسٹر جسٹس محمد منیر احمد صاحب (مرحوم) چیف جسٹس آف پاکستان کے خیالات	//
	//
• مسٹر جسٹس انوار الحق کا بیان	//
• جناب غلام مصطفےٰ جتوئی کا بیان	۶۰۰
• ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد	//
• مس بے نظیر بھٹو کا بیان	//
• سابق وزیرِ دفاع میر علی احمد تالپور کا فرمان	//
• جناب غلام احمد پرویز صاحب مرحوم کا تبصرہ	۶۰۱
• قائدِ اعظم کے مختلف بیانات	//

عنوان	صفحہ
• ان واضح ارشادات کے باوجود	۶۰۲
• پاک چین دوستی انجمن کے سربراہ جناب ممتاز احمد خان صاحب کی وضاحت	۶۰۳
• ایک انٹرویو	۶۰۶
• فضا گونج اٹھے گی	۶۰۷
• قائد کی پکار	//
• صوبہ سندھ	۶۰۸
• جی ایم سید کی تقریر	//
• سندھ یونیورسٹی میں "سندھی شام"	//
• جی ایم سید کا انٹرویو	۶۰۹
• جی ایم سید کی شہرت	//
• سندھی طالبہ کا خط	۶۱۰
• سندھ تنظیم	۶۱۱
• صوبہ سرحد	۶۱۲
• عبدالغفار خان کی تقریر	//
• مہاتما گاندھی سے گلہ	//
• بھارت کا دورہ	۶۱۳
• ٹائمز آف انڈیا سے انٹرویو	//
• مجلس دستور ساز میں تقریر	//
• ولی خان صاحب کے مختلف بیانات	//
• اس کے باوجود یہ حضرات مخلص ہیں	۶۱۴
• حسین احمد مدنی اور خدائی خدمتگار	۶۱۵
• این ڈی پی کے نزدیک باچہ خان کا مقام	//
• پختون تحریک کے صدر کی تقریر	//

عنوان	صفحہ
• صوبہ بلوچستان	۶۱۶
• غوث بخش بزنجو اور سردار اکبر بگٹی کا انٹرویو	//
• ۱۹۴۰ء کی قرارداد کا ذکر	۶۱۷
• ایک ریاست یا متحدہ ریاستیں	//
• ۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن	۶۱۸
• قائداعظم کا تصور	۶۱۹
• گاندھی جناح خط و کتابت	//
• ۱۹۴۶ء کا کنونشن	۶۲۱
• ۱۹۷۲ء کا مقالہ	۶۲۲
• ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی مزید وضاحت	//
• نواب بگٹی	۶۲۴
• بزنجو صاحب کا بیان	۶۲۵
• پاکستان میں چار قومیں بستی ہیں	//
• افغانستان میں روسی فوجیں	//
• بزنجو۔ ولی تعلقات	۶۲۶
• کوئٹہ کے واقعات۔ ایک خطرناک عنصر کی نشاندہی	//
• اس مرض کا علاج	۶۲۷
• صوبہ پنجاب	//
• پنجاب کو صوبائی خود مختاری کا سبق	۶۲۸
• یہ معرکہ کس طرح سر ہوگا	۶۲۹
• لندن پلان پر تبصرہ • اہل پنجاب سے التماس	۶۳۰
• کوثر نیازی صاحب کی تجویز • ہمیں سوچنا چاہیئے	۶۳۱
• ہماری ناقدر شناسی	//
• قائداعظم سے ہمارا سلوک	۶۳۲

عنوان	صفحہ
• اس مرض کا آخری علاج	۶۳۲
اُنیسواں باب	
دُنیا کی حالت زار	۶۳۶
• یہ زبوں حالی کیوں؟ • اجتماعی زندگی کا مقصد	//
• اسلحہ کی تجارت • ایران اور عراق کی جنگ	۶۳۷
• سائنس دانوں کی آہ وفغاں	۶۳۸
• ربع صدی اور فوجی اخراجات	۶۳۹
• سویڈن حکومت کی رپورٹ	۶۴۰
• نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور جنگ	۶۴۱
• ایٹم بم کے استعمال کا ارادہ	//
• ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کی اپیل	۶۴۲
• بڑھتے ہوئے جوہری خطرات	//
• چین کی فوجی قوت • عالم اسلام کی حالت	۶۴۴
• ملتِ اسلامیہ کی دولت کا مصرف	۶۴۶
• اُونٹوں کی ریس کے لئے معصوم بچوں کا شکار	۶۴۸
• امریکہ کی حالت	//
• قمار بازی کی وبا • جنسی بدنہادی	۶۴۹
• ہیروئن کے بعد کریک	۶۵۰
• امریکی معاشرہ کی اندرونی حالت	۶۵۲
• چین کی حالت	۶۵۳
• جاپان میں خودکشی کا رجحان	۶۵۴
• ہندوستان کی حالت • برطانیہ کا انحطاط	//

عنوان	صفحہ
• دنیا عالم کے متعلق عالمی ادارہ کی رپورٹ	۶۵۵
• پاکستان میں منشیات کا رجحان	۶۵۶
• چار ارب کی آمدنی	۶۵۷
• کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات	۶۵۸
• ہیروئن بے بی	۶۶۰
• جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی پکار	//
• ذہنی دباؤ اور کھچاؤ کی بیماریاں	۶۶۱
• امراض قلب کی وبا • حقانی صاحب کی دلسوزی • امراض چشم	۶۶۲
• رئیس امروہوی صاحب کی پکار	۶۶۳
• عقل وفکر کی ناکامی • عقل کی فتوحات	//
• حقیقت کا اعتراف	۶۶۴
• عقل سوال کرتی ہے • خدا تعالےٰ کا جواب	۶۶۵
• ستاروں کی مثال • کائناتی معجزات	۶۶۶
• اِس حسن کی وجہ جواز	۶۶۸
• سابقہ اقوام اور مقامِ عبرت	۶۶۹
• وحی اور عقل کا رشتہ	۶۷۰
• بیمار انسانیت کی جستجو	//
• حقیقی کائناتی شعور کی عظمت	۶۷۱
• علامہ مشرقی کا دُنیا کے ہوشمند انسانوں کو خطاب	۶۷۲
• عالمِ فطرت کا مقام بلند ہے	۶۷۷
• الجھے ہوئے انسانی سکون کا حل	۶۷۹
• مملکت پاکستان کیوں	۶۸۱

دیباچہ

ہمارے اس دَور کے ماہرِ سیاسیات ایچ۔ جے مینکن (H.J. MENCKEN) نے اپنی کتاب
TREATISE ON RIGHT AND WRONG میں لکھا ہے:

"تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لیے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے، اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ جب حکومت ہاتھ آجاتی ہے تو اس پبلک کی حکومت نہیں بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے۔"

مندرجہ بالا حقیقتِ حال کے پیشِ نظر اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر ایسا کیوں ہے تو اس کا جواب علامہ اقبال کے الفاظ کے علاوہ اور کچھ ہو نہیں سکتا کہ ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات

یہی وہ بنیادی خامی تھی جس کے پیشِ نظر خدائے علیم نے نوعِ انسانی کو قرآن حکیم کی روشنی عطا فرمائی تاکہ وہ زندگی جیسی عظیم نعمت کو "زبوں کارِ حیات" ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اس وحی خداوندی کی روشنی میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس سے مقصود یہ تھا کہ آنے والی نسلیں اِس پیش کردہ قرآنی تعلیم پر قولاً اور فعلاً ایمان لا سکیں۔ لیکن افسوس کچھ ہی عرصہ بعد امتِ مسلمہ وحی کے اس متعین کردہ راستے پر گامزن نہ رہی اور آہستہ آہستہ اس کی حالت بھی اس اونٹنی کی سی ہو گئی جو کمزور و ناتواں ہونے کے باعث اپنے قافلے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور مضمحل ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ

اُمّتِ مسلمہ کی اس زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے علاّمہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

رشتۂ وحدت پر قوم از دست داد
صد گرہ بر روئے کار ما فتاد !

جب اُمّتِ مسلمہ نے وحدت دیکھتی کے مشرب کو خیر باد کہہ دیا اور اُمّتِ واحدہ فرقوں میں تبدیل ہوگئی تو ہمارے ہر کام میں ہزاروں رخنے پڑنے شروع ہوگئے۔ ہماری کامیابی کا راز ملّت کی وحدت میں تھا۔ جب یہ وحدت گئی تو ہماری سرفرازیاں بھی ختم ہوگئیں۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ ؎

ما پریشاں در جہاں چو اختریم
ہمدم و بے گاہ از یک دیگریم !

ہم تعداد کے لحاظ سے تو کثیر ہیں لیکن ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بظاہر ایک دوسرے سے واقف اور قریب ہیں لیکن درحقیقت ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک الگ الگ راستے پر چلتا اور اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے محور کے گرد گھومتا ہے۔ ہمارا نصب العین حیات اور ایک روشِ زندگی نہیں۔ اِس لیے قائدِ اعظم نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے اہلِ پاکستان سے اپیل کی تھی کہ :

"اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں اوّل و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لیے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ مملکت ہے۔ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ سندھی کی ہے اور نہ پٹھان کی بلکہ یہ آپ سب کی ہے۔ اس لیے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لیے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے ویسی ہی لعنت جیسی فرقہ بندی شیعہ سنّی کی تفریق ہے۔"

لیکن ملّت اسلامیہ ہزار سال سے مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کی اسی لعنت میں گرفتار ہے جس کی بنیادی وجہ علاّمہ اقبال کی نظر میں صرف یہ ہے کہ :

"عربی اسلام ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے (کیونکہ) ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں اور ان کو عربی اسلام اس کے نصب العین اور اس کی غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔" (بحوالہ الواردِ اقبال۔ صفحہ ۹۳-۱۹۲)

چنانچہ اس نصب العین حیات اور اس روشِ زندگی کے فقدان کے باعث نہ تو یہ اُمّت خود اُمّت واحدہ

رہی اور نہ ہی دنیائے عالم کو نیشنلزم کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے ترغیب دے سکی۔ وہ نیشنلزم جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اہلِ یورپ کے ایک مفکر نے کہا تھا کہ :

" نیشنلزم جسے ہم نے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے اس کی وجہ سے دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کی بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقتدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور ان پچاس دیوتاؤں میں سے ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملکیتی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتا ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی انائیت خود اور اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں بلکہ اس کا وجوب ہوتا ہے یاد رکھیے ہر نیشنلزم ایک ملت پرستانہ مذہب ہے۔" (انسان نے کیا سوچا صفحہ ۲۴۱ - ۲۴۰ - از پروفیسر)

ہماری یہی وہ بے اعتنائی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صدر ایوب خاں مرحوم نے ایک مرتبہ قاہرہ یونیورسٹی میں ایک ایسی تقریر کی تھی کہ جس کا ایک ایک لفظ آج بھی ہر صاحبِ درد دل کے لیے بانگ درا کا کام دے گا۔ آپ نے فرمایا :

" جوں جوں ہم دین کی رُوح سے دُور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہُوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا۔ اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل متحرک اور حرکت بخش ضابطہ حیات بنے۔ محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اس دنیا میں جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مُڑ مُڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے۔ اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں۔ لہٰذا اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے

کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دُور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ہم دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ کی غلامی سابقہ دَور کی غلامی کے مقابلہ میں بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔" (ڈان ۱۵ر نومبر ۱۹۶۰)

راقم نے اس مہلت کے وقفے کے پیشِ نظر مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کی خاردار وادی سے تصنیف و تالیف کی شکل میں، جو یہ خار اپنی پلکوں سے چننے کی کوشش کی ہے وہ صرف اور صرف اس لیے ہے کہ آج کا انسان قرآنی معاشرہ کی اس فردوس گم گشتہ کو پانے میں کامیاب ہو سکے جس فردوس کی بادِ نسیم اور جس کے پھولوں کی مہک کسی نفسیاتی بیماری کو باقی نہیں رہنے دیتی اور جس کی رنگین فضا انسانی آنکھ میں اس قدر چمک پیدا کر دیتی ہے کہ پھر زندگی کے طویل سفر کی کوئی منزل بھی تاریک نہیں رہتی۔ جس میں تیری میری کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ جہاں ہر شخص محض انسان ہونے کی جہت سے عزّت و تکریم کی نظروں سے دیکھا اور پہچانا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس جہانِ نو میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اس میں جنگ و جدل اور افراط و تفریط کی کوئی گنجائش تک باقی نہیں رہتی نہ ہی اس میں سیاسی طور پر حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کا کوئی تصوّر ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی فرقہ اس میں بار پاتا ہے۔ اس قرآنی معاشرے کا میزبان انسان کی بجائے خود خدا ہوتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ جس جہانِ نو کا میزبان خود خدا ہو وہاں نہ کوئی فرعون باقی رہتا ہے نہ ہامان اور نہ قارون۔ نتیجہ یہ کہ اس معاشرے میں نہ کسی کو بھوک ستاتی ہے اور نہ پیاس، نہ کسی کو موسم کی سردی کی فکر ہوتی ہے نہ گرمی کا اندیشہ۔ اور وہ اس لیے کہ اس قرآنی معاشرہ میں رزق کے سرچشموں سے ہر ضرورت مند اس طرح متواتر مستفید ہوتا ہے جس طرح پیاسا جوئے آب سے۔ اس کے علاوہ یہاں سکونِ قلب کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نہ تو کسی کو کوئی خوف ہوتا ہے نہ حزن۔ کیونکہ اس نظامِ زندگی میں کسی لات و منات کی حکمرانی نہیں ہوتی۔ المختصر یہی وہ قرآنی نظامِ حیات ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان پر اور ان شاخوں کا پھیل ان افراد کے جسموں میں ایسا صالح خون پیدا کرتا ہے کہ ان کے چہرے کی چمک کبھی ماند نہیں پڑتی۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن رہتا ہے جس وقت تک انسانی عقل وحی کو اپنا امام بنائے رکھتی ہے۔

اور اب یہ دیکھنے کے لیے کہ ملّتِ اسلامیہ نے وحی کی بجائے صرف عقلِ انسانی کو ہی اپنا امام تسلیم کر لینے سے کیا کھویا اور کیا پایا تو اس مقصد کے لیے ہمیں کئی ایک موضوعات کو سامنے لانا ہوگا۔

لہٰذا زیرِ نظر کتاب میں جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ان کا تعلق مسئلے مسائل سے نہیں بلکہ ہماری عملی زندگی سے ہے اور وہ اس لیے کہ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

مذہبی بحث میں نے کبھی کی ہی نہیں　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

راقم نے کتاب میں مختلف موضوعات کے تحت جن امور کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں :-

پہلے حصّے میں زیرِ بحث آنے والے عنوانات

قرآن حکیم کی افضلیت و اہمیت اور امّت واحدہ کے سلسلہ میں اس کی تعلیم و ترغیب کا تفصیلی ذکر، لیکن اس قولِ فیصل کتاب کے ہوتے ہوئے جماعتی اور غیر جماعتی انتخابات کی طویل بحثیں، جھگڑے اور اکابرین کے مختلف بیانات، مقامِ حدیث اور کفر کے باہمی فتاوے، فقہی اختلافات اور اس کے نتائج، اجتہاد کی اہمیت اور اس سے انحراف، ایک آنے والے کا تصور اور ختمِ نبوت، فرقہ واریت پر مبنی قرآنِ حکیم کے تراجم، اور تفاسیر اور پھر فرقہ پرستی کے تحت مساجد کا استعمال اور ان پر قبضہ کی کوششیں، کتاب و سنّت کی مروجّہ اصطلاح کے متعلق چند ایک گذارشات، ایک متفقہ علیہ اسلامی آئین کی تدوین میں سب سے بڑی رکاوٹ کی وجہ جواز، علمائے کرام کا اسلامی آئین کے مدون کرنے میں حصّہ، ۳۱ علمائے کرام کے ۲۲ نکات کا تجزیہ، ہماری عجمی تاریخ اور اس کے اثرات میں گرفتارِ ملّتِ اسلامیہ قرآنِ حکیم اور اعراب، قرآنی آیات کے متعلق ناسخ و منسوخ کا عقیدہ، قرآنِ حکیم کا معاشی نظام اور عجمی نظام کا تقابلی جائزہ، اور اخبارات کے اداریے، ۱۹۸۲ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے زکوٰۃ کمیٹی کا تقرر اور اس کی رپورٹ اور موجودہ حکومت کی مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ میں زکوٰۃ کی تعریف اور قرآن کے معاشی نظام کے خدوخال، عشر اور ربوٰ کا قرآنی مفہوم، سکولوں۔ کالجوں۔ اور دارالعلوموں میں دین کے نام پر دی جانے والی مذہبی تعلیم اور اس کے دُور رس اثرات کا اجمالی ذکر، مرد کے پنجۂ استبداد میں عورت کی مظلومیت، علمائے کرام کے متعلق دانشوروں کی رائے اور پھر تصوّف اور اس کی مختلف شاخوں یعنی وحدت الوجود، کشف و الہام اور انسانی ذات کا خدا کی ذات کے ساتھ "رشتہ" اور اس کے متعلق علّامہ اقبال کی قرآنی بصیرت کی تفصیل، تبلیغی جماعت کی تگ و تاز اور اس کا ماحصل، اسلامائزیشن اور فنڈامنٹیلزم کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کے خطرناک نتائج، فریضۂ حج کے مقاصد کا ذکر شامل ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آخر قرآن حکیم کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور یہ کہ قرأت کے اختلاف کی حقیقت کیا ہے۔

دوسرے حصّے میں زیرِ بحث آنے والے عنوانات

پہلے حصّے کے بعد دوسرے حصّے میں زیرِ بحث لائے جانے والے موضوعات درج ذیل ہیں :-

تحریکِ پاکستان کے بارے میں نظریاتی اور سیاسی مشکلات، ہندوؤں کی عیّار سیاست، انگریز کی ریاکاری اپنوں کی بے اعتنائی، مخالفت اور روگردانی کے مختلف طریق اور حربے اور ان حالات میں گھرے ہوئے دو قومی نظریہ کے محافظ علّامہ اقبال کے مردِ مومن اور مردِ آہن، قائدِ اعظم کی عظیم شخصیّت کے پائے استقلال کے نقوش

اوران کی شبانہ روز محنت کی تفصیل، تشکیلِ پاکستان کے بعد پھر اپنوں کے ہی ہاتھوں اس مملکت کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کو کمزور کرنے کی گہری سازشوں کی جگر خراش داستان، ون یونٹ کی بجائے چار صوبوں کی تفریق اور پھران میں چار قومیتوں کا نعرہ اوراس کے بعد علاقائی خود مختاری اس کے ساتھ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانے کا ذکر اور اس کی دینی وجوہات اور اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار، اُمّت کے سلسلہ میں اس تمام تر اور طویل تر داستان کے علاوہ قندیلِ آسمانی سے محروم دنیائے عالم کی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی بے چارگی کا ذکر المختصر کتاب کے ایک ایک ورق پر علمی، مادی، ثقافتی، تہذیبی، نظریاتی اور طبقاتی تفریق کا جائزہ لینے اوراس کی وجوہات بیان کرنے کے ساتھ اس کے سدِّ باب کا بنیادی علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

کتاب میں تقریباً (۱۶) صفحہ کا ایک طویل خط جو ملک کے نامور دانشوروں، یونیورسٹی کے وائس چانسلروں اور حکام کے نام تحریر کیا گیا تھا شامل کر دیا گیا ہے جس میں ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ ہونے والی اس گہری سازش کا ذکر اور قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخر یہ جنّت سے نکلا ہُوا آدم اور مسجود ملائکہ اب حقیقی معنوں میں کب اور کس طرح مسجود ملائکہ بن سکے گا۔ اور وہ فردوسِ گم گشتہ دوبارہ کب اور کس طرح اس کے ہاتھ آئے گی؟

قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اس لیے قوم کے یہی وہ نئے افراد ہیں جنہیں یہ روشناس کرانے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے کہ قرآنی آئیڈیالوجی کیا ہے، پاکستان کی غرض و غایت سے مقصود کیا تھا، اس کے حصول کے لیے محسنانِ ملّت کو کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ لہٰذا اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مجھے امید واثق ہے کہ یہ کتاب ہر آنے والی نئی نسل کے لیے حقائق تک پہنچنے کی خاطر یقیناً ممد و معاون ثابت ہوگی۔

لہٰذا راقم نے اپنی آنکھوں کی شبنم اور خونِ جگر سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ اسی امید کی بنا پر ہے کہ

شاید کوئی غنچہ چٹکے شاید کوئی پھول کھلے!
اس اِک آس پہ گلشن گلشن ہم نے نغمے گائے ہیں

اظہارِ تشکر

کتاب ہذا کی تالیف کے لیے راقم کو کئی ایک علمی ذرائع سے استفادہ کرنا پڑا۔ جس میں ملکی اخبارات و جرائد اور رسائل اور کتابوں کے علاوہ جناب رئیس امروہوی۔ جناب ش داحمد حقانی۔ جناب پروفیسر محمد عثمان۔ جناب رفیق احمد باجواہ۔ جناب عبدالقادر حسن۔ جناب محمد سعید (سابق ڈپٹی

ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ) جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ (سابق ڈائریکٹر محکمہ اوقاف) جناب پیر علی محمد راشدی۔ جناب پروفیسر وارث میر۔ جناب مسکین حجازی (چیئرمین شعبۂ صحافت پنجاب یونیورسٹی) محترمہ حمیرا ہاشمی۔ قرآنِ حکیم کی طالبہ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ۔ جناب حافظ محمد یعقوب تاجیک۔ قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں اسلامیات کے پروفیسر جناب سید نواب حیدر نقوی۔ مرکزی وزارتِ خزانہ کے سیکرٹری جناب ایچ۔ یو بیگ۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر جناب رفیق احمد۔ پشاور یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر جناب میاں ایم نذیر۔ جناب حنیف رامے (سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب) تحریکِ تعمیرِ انسانیت لاہور کے حوالہ سے قرآنِ حکیم کے نوجوان اتالیق اور صاحبِ نظر جناب محمد علی فارق (ایم اے سیاسیات۔ ایم اے عربی) جنہوں نے کتاب ہذا کے مسوّدے کی پروف ریڈنگ بھی کی نیز جناب قربٹ صاحب کے اُن تمام اہم اور علمی شخصیات کا بھی ممنون ہوں جن کی تحریریں کسی نہ کسی شکل میں میرے کام آئیں۔ خصوصاً تحریکِ طلوعِ اسلام کے بانی جناب غلام احمد پرویز صاحب مرحوم کا ممنون اور مشکور ہوں جن کی درجنوں کتابیں اور ۱۹۳۸ء سے ۱۹۸۶ء تک ماہنامہ طلوعِ اسلام کے ہزاروں صفحات میرے لیے وجہِ تکمیل تصنیف و تالیف بنے۔

جہاں تک جناب پرویز صاحب کی ذات کا تعلق ہے، مجھے اس سلسلہ میں قارئین کی خدمت میں اپنی زبان سے نہیں بلکہ آغا شورش کاشمیری (مرحوم) کی زبان سے ایک گزارش کرنا ضروری ہے جو آپ نے پرویز صاحب کی کتاب "شاہکارِ رسالت" پر تبصرہ کرتے ہوئے کی تھی۔ جس کا اقتباس یہ ہے:

"ایڈیٹر چٹان کو آج تک غلام احمد پرویز سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا، کبھی ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی عظیم کتاب "شاہکارِ رسالت" پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز صاحب بارگاہِ رسالت میں سرفراز ہو کر باریاب ہوں گے۔ اور یہ کتاب ان کے لیے توشۂ آخرت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان فضلاء کے ساتھ اپنی جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لیے ہر دور میں دھڑک رہے ہیں۔"

اس تحریر کے بعد آغا صاحب (مرحوم) علماء حضرات سے اپیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب بھی افکارِ اسلام کی کربلا میں حسینی قافلے کی ایک آواز ہے۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتویٰ واپس لینا چاہیئے۔"

اس کے بعد جہاں تک پرویز صاحب کے تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظم کے ساتھ قرآنی مراسم کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں مولانا کوثر نیازی صاحب نے پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس منعقدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۶ء میں بانیٔ پاکستان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"جناب غلام احمد پرویز جن سے کسی کو ہزار اختلاف ہو لیکن قائدِ اعظم کے ساتھ ان کی رفاقت اور تحریکِ پاکستان میں ان کی قلبی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔"

اور اس کے بعد مولانا صاحب نے مزید فرمایا کہ :

"سابق مذہبی تاجر نہ تھے، مذہب کے مفکر تھے اور دنیاوی امور میں پروٹوکول کا شدت سے قائل و عامل جس کا اپوائنٹمنٹ کے بغیر ملنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کی جلوت و خلوت میں اس شخص (پرویز صاحب) کو ہر وقت ہر لمحے تمام فارمیلیٹیز کے بغیر حاضر ہونے کی اجازت تھی۔ یہ انہیں کلام اللہ میں تدبر کرنے کے لیے آیاتِ قرآنی سُنایا کرتے تھے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ء)

ان تصریحات کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ قائدِ اعظم جیسی علمی، سیاسی اور قرآنی بصیرت رکھنے والی شخصیت کے اس قدر قریب تر رہنے والے کی اگر کوئی بات ہمارے سامنے آجائے تو اسے خالی الذہن ہو کر بغیر کسی تعصب کے ضرور سُن لینا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ اسلام کی کربلا میں حسینی قافلے کی یہ آواز ہمارے کسی کام آجائے۔

بہر حال مَیں نے کتاب ہذا کے شروع سے آخر تک جو کچھ عرض کیا ہے اس سے مقصد صرف علامہ اقبال کے اس شعر کی تشریح کرنا ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ : ؎

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

لہٰذا راقم نے ان عجمی سازشوں کی بنا پر پیدا ہونے والے ان مختلف امراض کی جو نشان دہی کی ہے اور اس کا جو علاج تجویز کیا ہے یہ سب کچھ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا ہر وقت امکان موجود ہے جس کی تصحیح کے لیے مَیں قارئین کی طرف سے راہنمائی کا منتظر رہوں گا۔ بشرطیکہ یہ نشان دہی قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ نہ کسی خاص مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کے مسلک کے مطابق۔ بہر حال اگر میری یہ حقیر سی کوشش کسی کام آگئی تو شائد روزِ محشر مَیں اس سرمایۂ حیات کے سہارے خدائے رحیم و کریم کی بارگاہ میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ یہ کہنے کے کچھ قابل ہو سکوں کہ ؎

داورِ حشر مجھے تیری قسم !
عمر بھر مَیں نے عبادت کی ہے
تُو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
مَیں نے انساں سے محبّت کی ہے

لاہور
جنوری ۱۹۸۷ء

محمّد اشرف ظفر

نوٹ

زیرِ نظر موضوعات میں قرآنی آیات کے حوالہ جات کی ترتیب اس طرح ہے۔ مثلاً $\frac{\text{۳۹ (سورت)}}{\text{۲۷ (آیت)}}$

آیات کے علاوہ کتاب ہذا میں درج کیے گئے اقتباسات اور ان کے حوالہ جات انتہائی احتیاط سے نوٹ کیے گئے ہیں۔ پھر بھی کہیں کوئی غلطی ہو، تو اسے سہوًا تصور کیا جائے۔ قارئین کے مطلع فرمانے پر ممنون ہوں گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ (راقم)

نظرِ ثانی

یہ اس خالق کائنات کا احسانِ عظیم ہے کہ جس کی بے پناہ نوازشوں سے آج مجھے کتاب کا دوسرا ایڈیشن پیش کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

انفرادیت کے اس جنگل میں نوع انسانی کی اجتماعی ابتری کے پیش نظر عموماً اور ملتِ اسلامیہ کے ان بکھرے ہوئے تسبیح کے دانوں کو ایک لڑی میں پروتے کے لئے خصوصاً اس تصنیف میں کس حد تک اور کس قسم کا مواد موجود ہے اور یہ ہمیں آپس میں ایک دوسرے کے قریب لانے میں کس حد تک ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ انہی قارئین کو ہے یا ہو گا جنہوں نے اس کا مطالعہ از خود کیا ہے یا کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ

میرے لہو نے ٹپک کر جنہیں تراشا ہے
وہ گلستان کبھی ویراں ہو نہیں سکتے

کتاب کے اس نئے ایڈیشن کے موقع پر جہاں راقم ان قابل صد احترام اور محسن شخصیات جناب میرزا ادیب جناب ظفر علی راجہ، محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ، جناب حافظ محمد یعقوب خاں تاجیک، جناب محمد علی فارق کا دوبارہ ممنون ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ (جن کے تاثرات پہلے ایڈیشن میں شائع ہو چکے ہیں) وہاں اب میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے صدر جناب مکین علی حجازی، جناب محمد یوسف گورایہ، جناب ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نیز ملکی اخبار پاکستان ٹائمز اور روزنامہ نوائے وقت کے علاوہ ادارہ طلوع اسلام اور ادارہ تعمیر انسانیت اور ماہنامہ ندائے فرقان کے مدیر سنوں ابو سلمان قاضی محمد کفایت اللہ ایم۔اے کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میری اس فقیرسی کوشش کو پذیرائی بخشی اور اس کے متعلق اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا۔

کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن اٹھارہ مختلف ابواب پر مشتمل تھا جب کہ یہ دوسرا ایڈیشن انیس ابواب کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ نیا باب "پاکستان کے سابق حکمران کردار کے آئینہ میں" کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے جس میں غلام محمد مرحوم سے لے کر جنرل ضیا الحق مرحوم تک کا ذکر شامل ہے اس نئے باب کے علاوہ دیگر ابواب میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا ہے مثلاً قرآنی تعلیم کے علی الرغم سیاسی پارٹیوں کے وجود کو برقرار رکھنے کے متعلق تحریر کے لئے مختلف سیاسی اور مذہبی اکابرین کے بیانات کے بدبے نظیر بھٹو کے بیس ماہ کے دورِ حکومت میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین رونما ہونے والی باہمی چپقلش، خلفشار اور بدنظمی کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے اور پھر اس غیر قرآنی نظام حیات کے عبرت ناک نتائج کے باوجود جناب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کو

ڈیڑھ ہزار سال میں پہلی مرتبہ دربار نبویؐ سے "پاکستان عوامی تحریک" کے نام پر سیاسی فرقہ بندی کو مزید فروغ دینے کی خاطر ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرنے کی اس "منظوری" کی روداد کو بھی محفوظ کیا ہے جو "منظوری" موصوف کو خاص طور پر روضہ اقدسؐ پر حاضری کے دوران ملی..... یہ داستان ہمارے سب کے لئے قابلِ غور بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔

" عورت کی حالت زار" کے باب میں عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر جناب مولانا مودودی (مرحوم) اور جناب مولانا کوثر نیازی صاحب کے علاوہ کئی ایک مختلف حوالوں کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ قرآن حکیم کے معاشی نظام کے باب میں مروجہ زکوٰۃ کے مفہوم کے سلسلہ میں کسی قدر اضافہ ہوا ہے۔

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ ہماری مروجہ شریعت کا تمام تر انحصار عقل وخرد کی بجائے تقلید محض پر ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مستند مذہبی مدارس کی تعلیم وتدریس معقولات کی بجائے منقولات پر مبنی ہے علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس فراہمیٔ بصیرت کے باوجود ہم نے علامہ کے نام پر سنگ وخشت کے پرشکوہ ایوان تو تعمیر کئے لیکن ان کی طرف سے عطا کردہ قرآنی فکر ونظر کے ایوان کی بنیادوں تک کو منہدم کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ علامہ اقبال جنہوں نے اپنے خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں کہا تھا کہ (مسلم مملکت کے قیام سے) " اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے" لیکن سوال یہاں یہ ہے کہ کیا ہم نے مختلف ادوار میں شریعت کے نام پر عرب ملوکیت کے اس ٹھپے کو جسے مٹانے کے لئے پاکستان کا قیام جو بے پناہ قربانیوں کی بدولت عمل میں آیا تھا اس کو مزید گہرا کرنے کے علاوہ اور کچھ کیا ہے؟ اس کا ایک عملی مظاہرہ سینیٹر جناب سمیع الحق کی طرف سے پیش کردہ وہ شریعت بل بھی ہے جس کو ۱۹۹۰ء میں سینٹ نے ۵ سال کے بعد منظور کیا اور اب یہ بل پاکستان کی قومی اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش ہونے والا تھا کہ جناب صدر غلام اسحاق خاں نے اس ملکی ادارے کو بدنظمی اور سیاست کے باہمی انتشار کا باعث قرار دیتے ہوئے ۱۹۹۰ء - ۸ - ۶ کو توڑ دیا۔ اس قسم کے المیے کے پیش نظر جناب فیض کوثر صاحب نے کیا خوب کہا ہے؟

رہزن کو ڈھونڈتے ہیں مسافر اِدھر اُدھر
رہبر سے کارواں کی قیادت نہ ہو سکی

اس شریعت بل کے متعلق ممتاز روحانی پیشوا اور سینیٹر جناب پیر پگاڑا کا کہنا یہ ہے کہ شریعت محمدیؐ اور شریعت سمیع الحق میں بنیادی فرق ہے اور سینیٹ شریعت بل بعض مرحومین کی روح کو ایصالِ ثواب کی خواہش کے سوا اور کچھ نہیں" آپ نے مزید فرمایا کہ

"شریعت بل کے محرکین اور صدر غلام اسحاق کا تعلق ایک علاقے اور ایک مکتبِ فکر سے ہے اس لئے (صدر کی طرف سے) سمیع الحق کو دی جانے والی مبارک باد دونوں کا ذاتی مسئلہ ہے" موصوف نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ ملائیت کے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے اذانیں دی جائیں" (بحوالہ ہفت روزہ "رضا کار" لاہور ۸ جون ۹۰ء صفحہ ۵)

سو راقم نے باب فتنہ میں فرقہ واریت پر مبنی اس جامد شریعت کی فسوں کاری کو توڑنے کے لئے علامہ اقبال کے حوالے سے کچھ بلند آواز سے اذان دینے کی مزید کوشش کی ہے ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام اذان کے ان الفاظ کو پسند کریں گے اس موقع پر ایک صاحب بصیرت شخصیت جناب اصغر علی گھرال ایڈووکیٹ بھٹی شہید "نشان حیدر" نامی کتاب کے مصنف کی ہم نوائی میں ہماری دعا ہے کہ

(پاکستان کی نئی نسل شریعت بل کے اس جال سے محفوظ رہتی ہوئی) "شاہ دولہ کے چوہوں میں تبدیل ہونے سے بچی رہے"

ان تمام کوششوں کے علاوہ تعلیم کے باب میں ایک نہایت اہم اضافہ پیدائش آدم کے متعلق ہے جس میں حضرت علامہ اقبالؒ اور حضرت علامہ عنایت اللہ خاں مشرقیؒ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور جہاں ان ہر دو مقتدر علمی شخصیات نے ہمارے ہاں صدیوں سے مروجہ تصورات کو غلط قرار دیتے ہوئے ایک دوسرا زاویہ نگاہ پیش کیا ہے قارئین کو یہ تمام معلومات "قصہ آدم کی پیدائش" کے عنوان کے تحت مل سکتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ اور علامہ مشرقی کے علاوہ مظاہر فطرت اور قرآن جیسی مشہور زمانہ کتاب کے مصنف جناب ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے حوالے سے بھی آدم کی پیدائش، ہبوطِ آدم، جنت اور ملائکہ پر مزید سیر حاصل معلومات فراہم کی گئیں ہیں جب کہ سیاسی فرقہ بندی کے باب میں قائد اعظمؒ کے سفر آخرت کی ایک واضح جھلک دی گئی ہے جو ہر صاحب فکر کے لئے اپنے اندر کئی ایک تحقیقاتی رموز لئے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں کتاب ہذا کے آخری باب "دنیا کی حالت زار" میں علامہ عنایت اللہ مشرقی کا وہ خط بھی شامل کیا گیا ہے جو آپ نے ۱۹۵۷ء میں دنیا کے ہوش مند انسانوں (سائنس دانوں) کے نام لکھا تھا۔ یہ خط نوع انسانی کے کائناتی شعور میں اضافہ کرنے کے لئے اپنی مثال آپ ہے۔

خدا کرے کہ ہمارے سامنے قرآن حکیم کی متعین کردہ وہ منزل آجائے جسے رب جلیل نے صراط مستقیم کہہ کر پکارا ہے۔

والسلام

محمد اشرف ظفر

۱۸ ستمبر ۹۰ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علامہ اقبال نے اپنے ہاں مثنوی اسرار و رموز میں مقامِ مومن کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا ۔

لالۂ کوہ بر سرِ کوہے دمید گوشۂ دامانِ گلچینے ندید
آتشِ او شعلۂ گیرد بہ بر از نفس ہائے نخستینِ سحر
آسماں ز آغوشِ خود نگذاردش کوکبِ وا ماندۂ پندار دش

بوسدش اوّل شعاعِ آفتاب
شبنم از چشمش بشوید گردِ خواب

پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر لالہ کا ایک پھول کھلا ہے۔ اس تک کسی گلچیں کا ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ صبح کی پاکیزہ ہوا اس کی پرورش کرتی ہے۔ آسمان اسے اپنی آغوش سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ سورج کی پہلی کرنیں اس کا منہ چومتی ہیں۔ شبنم اپنی زمزم باریوں سے اس کی آنکھوں سے نیند کی گرد صاف کرتی ہے۔ یہ کیفیت ہوتی ہے ایک مردِ مومن کی۔ جو ساری دنیا سے بلند ہو کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکتا ہے۔

یہ تھا وہ مردِ مومن جس کی تلاش میں علامہ اقبال عمر بھر سرگرداں رہے اور آخر کار پکار اُٹھے کہ ؏

اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی

سو کتابِ ہذا کے آئندہ تمام تر صفحات اسی مردِ مومن کے مقامِ بلند کے کھو جانے اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کی داستان اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔

آیئے ہم خالی الذہن ہو کر اِن اوراق کا مطالعہ کریں۔

CamScanner

پہلا باب

قرآن حکیم کی عظمت

مسلمان ہونے کے ناطے سے ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ حکیم جہاں زندگی کے تمام اہم اور بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ ۳۹/۲۷ ، ۳۰/۵۸ وہاں وہ ان اصولوں کو نہایت وضاحت کے ساتھ دلیل و براہین کے تابع بغیر کسی تضاد اور ابہام کے دو ٹوک تصریف آیات کی رو سے بیان بھی فرماتا ہے — ۱۷/۴۱ ، ۱۷/۸۹ کیونکہ اس طرح کی وضاحت خود خدا کے ذمہ تھی۔ ۱۷/۱۹ اور وہ اِس لیے کہ ہر صاحبِ عقل و بصیرت اِس سے سبق حاصل کر سکے۔ ۳۸/۲۹ بلکہ اس وضاحت کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ اور اضطراب کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ ۳۲/۲ ، ۲/۲ ، ۱۰/۳۷ اور نہ ہی اس میں کوئی کمی باقی ہے۔ ۱/۱۸ بلکہ یہ کتابِ عظیم اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں یہ چیلنج پیش کرتی ہے کہ یہ اگر من جانب اللہ نہ ہوتی تو اِس میں بہت سے اختلاف پائے جاتے۔ ۴/۸۲۔ لہٰذا یہ کتاب اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے قرآن حکیم سے کرائے اس نے یہ حکم ہی نہیں دیا بلکہ وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں۔ ۴۷ ، ۴۵ — ۵/۴۴ لہٰذا فرمایا کہ تم پر لازم ہے کہ اس کے مطابق فیصلے کرو۔ ۶/۱۱۵ ، ۵۰ ، ۴۹ ، ۵/۴۸ یہی وہ حکمِ خداوندی ہے جس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اختلافی امور کی وضاحت قرآنِ حکیم ہی سے کرتے تھے۔ ۱۶/۶۴ اور قرآن ہی سے نصیحت فرماتے تھے۔ ۶/۱۹ کیونکہ قرآن حکیم نازل ہی اِسی لیے کیا گیا تھا کہ انسان مشکلات میں نہ اُلجھ جائے ۲۰/۲ بلکہ اس لیے کہ انسان کو رسولِ خدا کی وساطت سے خطراتِ زندگی سے آگاہ کر دیا جائے۔ ۶/۱۹ اور اس میں ہر بات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ۱۶/۸۹۔

حدیث۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے رسولِ اکرمؐ نے اِس طرح ارشاد فرمایا کہ: "اگر میں ہدایت پر ہوں نبویؐ تو یہ قرآنِ حکیم کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے اور اگر غلطی کرتا ہوں تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے"

قرآن حکیم نے اپنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا ماحصل یہ بتایا ہے کہ اس سے مُردوں کو زندگی ملتی ہے۔ انسان کو اس سے ایک روشنی ملتی ہے جسے لے کر وہ دنیا میں پھرتا ہے۔ ۶/۱۲۳ اور یہ تعلیم سینے میں تنگی پیدا ہونے ہی نہیں دیتی۔ ۲/۷ بلکہ یہ انسان کو ظلمت سے نُور کی طرف لے آتی ہے۔ ۱۴/۱، ۵۷/۹، ۵/۱۶ اور پھر فرمایا یہی وہ لوگ ہیں جو صحیح راستے پر ہیں اور فلاح پانے والوں میں سے ہیں۔ ۲/۴،۵ ۷/۱۵۷ اور اسی طریق سے انسان ربّانی بن سکتا ہے۔ ۳/۷۸ — اور آخر پر یہ کہ یہ وہ نعمت ہے جو مکمل بھی ہے ۶/۱۱۶ اور غیر متبدل بھی ۶/۳۴ ۱۵/۹ — پھر یہ واضح ہدایت اور رہنمائی بھی ہے جو قدرت کی طرف سے بغیر کسی معاوضہ اور کاوش کے انسان کو مل گئی اور جس کے مل جانے پر خود خدا نے نوعِ انسانی کو پکارا اور کہا کہ تم نزولِ قرآن کی خوشی میں عید مناؤ اور مسرتوں کے جھولے جھولو۔ ۱۰/۵۸، ۱۶/۳۶ کیونکہ "یہ نعمت وہ ہے کہ جو کچھ تم اکٹھا کرتے ہو یہ اس سے کہیں زیادہ بیش بہا اور قیمتی ہے۔" — اور اسے نہ زوال آسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یہ وہ رسّی ہے جس سے تمہارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ اس سے خون کے رشتے نہیں بلکہ دلوں کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے تمہاری عداوتیں محبتوں میں بدل سکتی ہیں۔ اور دشمنی دوستی کا روپ دھار لیتی ہے۔ قرآن کی تلاوت کے بعد گروہ بندی نہیں رہ سکتی ۲/۱۱۳ اور صحیح راستہ پانے کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی بلکہ قرآن تو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنایا گیا ہے۔ ۵۴/۱۶، ۲۲، ۴۰۔

مجھے اس چیز کا احساس ہے کہ میرا موضوع صرف قرآن حکیم کی عظمت بیان کرنا ہی نہیں بلکہ مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی بھی ہے لیکن جس وقت تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ معاشرتی، سیاسی، عائلی اور تمدنی زندگی کے لیے جس چیز (قرآن حکیم) کو اپنا امام تسلیم کیا جا رہا ہے وہ کن کن خصوصیات کا حامل ہے؟ اس وقت تک اسے اس معاملے میں مرکزی حیثیت دی نہیں جا سکتی اور نہ ہی اسے اتھارٹی تسلیم کیا جا سکتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ تو ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو قندیلِ آسمانی ہونے کی وجہ سے ہماری مکمل راہنمائی کر سکتی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا کہ قرآن سے اعراض برتنے والوں سے زیادہ ظالم کون ہوگا۔ ۱۸/۵۷ لہٰذا یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآنِ حکیم نے فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی کس حد تک مخالفت کی ہے وہاں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ وہ اس اہم اور پیچیدہ مسئلہ کا آخر کیا حل پیش کرتا ہے؟ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کا یہ خطۂ زمین جو قرآن کی حکمرانی کے لیے حاصل کیا گیا تھا، اس کی یہ حالتِ زار کیوں ہے؟ اور اس کے ذمّہ دار کون لوگ ہیں۔ اور پھر یہ کہ اس خلفشار کے باعث نئی نسل جو آج اسلام کے نام سے اس قدر لاتعلق ہی نہیں بلکہ متنفر

ہو چکی ہے، اِسے ایک بار پھر قرآن حکیم کا گرویدہ کیوں کر بنایا جا سکتا ہے تاکہ یہ درخشندہ ستارے قرآنی حکومت کے لیے حاصل کردہ اس تجربہ گاہ کو عملی طور پر نوعِ انسانی کے لیے ایک مثالی حیثیت سے پیش کرنے کے قابل بن سکیں۔

فرقہ بندی اور قرآن حکیم

جہاں تک قرآنِ حکیم کے نزدیک فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی مخالفت کا تعلق ہے، وہ اسے نہایت خطرناک اور تباہ کُن تصور کرتا ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ میں ارشاد ہے کہ "انبیاءِ کرام کو جو دین دیا گیا تھا" اس میں تاکید کی جاتی تھی کہ وہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کریں" (۴۲/۱۳) — پھر کہا "اے جماعت مومنین تم مومن ہونے کے بعد شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔ تم ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ پیدا کیا اور اپنے اپنے فرقہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے جس پر وہ کاربند ہیں۔" ۳۰/۳۱، ۳۲ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ "جو مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے بنائی گئی ہو اس میں قدم تک نہ رکھو۔" اور اِس کے ساتھ یہ بھی متنبہ کر دیا کہ "جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور پارٹیوں میں بٹ گئے، اے رسول تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔ ۶/۶۰ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ خود کو عاشقِ رسولؐ قرار دے گا۔

فرعون کی سب سے بڑی سرکشی ہی یہ بتائی گئی کہ "فرعون انتہائی سرکشی پر اُتر آیا تھا، وہ مُلک کے باشندوں (قوم) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور پھر اپنی ابلیسی سیاست کی رُو سے کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا کبھی دوسری کو۔ ۲۸/۴

اور ایک دوسری جگہ فرمایا "اِن سے کہہ دو کہ خدا اِس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہاری پارٹیاں بنا کر تمہیں آپس میں بھڑا دے اور (اِس طرح) تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزا چکھا دے۔" ۶/۶۵ - قرآن حکیم نے اِس مہلک مرض کی طرف نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ اِس کی بیخ کنی کے لیے علاج بھی تجویز فرما دیا کہ "تم سب مِل کر اللہ کی رسّی (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ اللہ کی اِس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اُس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس طرح تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔" ۳/۱۰۳ اور اِس حقیقت کو رسولِ خدا نے اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں جو پوری انسانیت کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے تقریباً ایک لاکھ ۲۴ ہزار کے

صحابہ کرام رضؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے اگر اس پر قائم رہے اور وہ خدا کی کتاب ہے اور ہاں یاد رکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ اپنی انہیں باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے" اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا "میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد ــــ یقین جانو جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی زندگی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔" لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو؟ فرمایا "ہاں اگر یہ نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا ہے اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو" ایک روایت میں حضورؐ نے فرمایا "جو جماعت سے الگ ہوا وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا۔" دوسری جگہ فرمایا "جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔"

اور اس حکم خداوندی اور حکم رسولؐ پر عمل نہ کرنے والوں کے متعلق رسولِ خدا قیامت کے روز فرمائیں گے کہ "اے باری تعالےٰ یہ لوگ ہیں جنہوں نے تیرے قرآن پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا" ۲۵/۳۰ لہٰذا اگر قرآنی تعلیم کی روشنی میں دیکھا جائے تو خدا کے دین پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مسلمان نہ تو خود پارٹی بازی کا تباہ کن تصور اپنائے اور نہ ہی دوسروں کو اس کے لیے ترغیب دے۔ کیونکہ ایسا کرنے والا خدا کے دین سے خارج ہو جاتا ہے اور رسولِ خدا سے اس کا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رہتا۔ اور پارٹی بازی کی سیاست گری فرعونی عمل ہے اور شیطان کی پیروی کرنے کے مترادف ہونے کے ساتھ ساتھ شرکِ عظیم بھی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے پارٹی بازی اور تفرقہ پروری سے صرف منع ہی نہیں کیا اور اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں اس کا علاج ہی تجویز نہیں کیا بلکہ اس کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کر دیا جب فرمایا "اے مسلمانو! دیکھنا واضح احکام آجانے کے بعد تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے اور باہمی اختلاف کرنے لگے۔ یہ لوگ عذابِ عظیم میں مبتلا ہوں گے۔" قرآنی تعلیم کی اس طرح تکذیب کرنے والوں کی اس زندگی میں ہی اس کرۂ ارضی پر ہی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ "دین کی تکذیب سے اس قوم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں" ۷/۷۲ اور اس سے انسان پستیوں میں گر جاتا ہے ہوس سے اس کی حالت کتے کی سی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ (کس قدر) اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ ۷/۱۷۶ اور خوف کا عذاب ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ۷/۱۱۲، ۱۱۳۔

ٹیلی ویژن پر مذاکرہ

۱۹۷۰ء میں ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام بعنوان "دانشکدہ" زیرِ صدارت جناب اشفاق احمد صاحب ڈائریکٹر مرکزی اردو بورڈ ٹیلی کاسٹ کیا جاتا تھا جس میں مختلف حضرات اپنی تعمیری قسم کی اُلجھنیں پیش کرتے اور متعلقہ اہلِ دانش مل بیٹھ کر اُن کا حل پیش کرنے کی سعی فرماتے تھے۔ تو راقم نے قرآن کریم کی مندرجہ بالا تعلیم کے پیشِ نظر ملتِ اسلامیہ سے مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی پارٹی بازی کو ختم کرنے کے لیے مذکورہ بالا ٹی وی پروگرام "دانشکدہ" کے نام ایک خط تحریر کیا تھا جو مارچ ۱۹۷۰ء میں ٹیلی ویژن پر پون گھنٹہ زیرِ بحث رہا جس میں دیگر گذارشات کے علاوہ راقم نے یہ عرض کیا تھا کہ

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ پارٹی بازی سے ملی خلفشار اور انحطاط کے علاوہ خود انسان اپنی آزادیٔ رائے جیسی نعمتِ عظمےٰ کو پارٹی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور پارٹی کے اندر رہتے ہوئے وہ کسی صورت میں بھی اِس پارٹی کے کیے گئے فیصلے کے خلاف کسی اسمبلی میں بھی باآوازِ بلند یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری پارٹی کا یہ طے شدہ فیصلہ حق و انصاف پر مبنی نہیں۔ خواہ یہ طے شدہ فیصلہ واقعتاً قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہی کیوں نہ ہو، جب آزادیٔ رائے ہی باقی نہ رہے تو اِس سے انسانی عظمت کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے، اِس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

راقم نے اِس خط میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ:

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن حکیم نے اپنے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے تمام اُمت کو باہمی مشاورت کا سبق دیا ہے نہ کہ بے لگام مغربی جمہوریت کے تحت حزبِ اختلاف کا۔ اور کیا پھر یہ بھی حقیقت نہیں کہ اس قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر حضرت ابوبکرؓ کے دور میں حضرت عمر فاروقؓ نے کوئی حزبِ اختلاف قائم نہ کی اور نہ ہی حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں حضرت عثمانؓ یا حضرت عثمانؓ کے دور میں حضرت علیؓ نے حزبِ اختلاف کا کوئی وجود قائم کیا"

اور اس کے بعد اہلِ دانش کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ:

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ حکومت تمام پارٹیوں کو ختم کرتے ہوئے اپنے اپنے علاقے سے تمام کے تمام صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے امیدواروں کے لیے صرف اور صرف آزاد امیدوار کی حیثیت سے ہی الیکشن لڑنے کی بنیاد ڈالے اور اس کے بعد اسمبلیوں کے اندر اور باہر پارٹی بازی کی تشکیل

کو ہمیشہ کے لیے قانوناً جرم قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ اس طرح قوم جہاں پارٹی بازی کے خلفشار سے محفوظ ہو جائے گی وہاں ان کے ساتھ وہ لوگ جو قابلیت رکھنے کے باوجود پارٹی بازی کی لعنت میں اُلجھنا نہیں چاہتے قوم کی خدمت کے لیے آگے آسکیں گے۔"

لیکن افسوس اہلِ دانش کی طرف سے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب ملت کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔

فرقہ بندی کا نتیجہ

سچ تو یہ ہے کہ پارٹی بازی اور فرقہ بندی کے باعث انسان اپنی آزادئ رائے کو ہی دوسروں کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتا بلکہ نتیجتہً وہ خوف و حزن کا بھی شکار ہو جاتا ہے اور جب کوئی قوم اجتماعی طور پر پارٹی بازی میں اُلجھ کر رہ جائے تو وہ خوف کے باعث اعصابی مریض بن کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ دوسری قومیں اس سے کہیں آگے نکل چکی ہوتی ہیں۔ قرآنِ حکیم نے جماعت مومنین کو جو مشاجرت کی زندگی گزارنے سے منع فرمایا تھا تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان اپنی آزادئ رائے سے محروم ہو کر کہیں خوف و حزن کا شکار ہو کر نہ رہ جائے کیونکہ خوف و حزن میں مبتلا انسان نفسیاتی طور پر ہمیشہ انتشار و خلفشار کی آگ میں جھلستا رہتا ہے اور یہ وہ آگ ہے جس سے اس کی خداداد صلاحیتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں اور اللہ کا یہ شاہکار وہ کچھ نہیں بن سکتا جو کچھ اسے قرآن بنا دینا چاہتا ہے اور نہ ہی اس کی یہ صلاحیتیں کائنات کے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے کے کام آسکتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہ جیتا جاگتا انسان راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

فرقہ بندی پیدا کیسے ہوئی؟

اس مقام پر یقیناً سوال پیدا ہوگا کہ آخر انسان میں یہ مرض پیدا کیونکر ہوتا ہے تو اس کا جواب بھی قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ ہے کہ "یہ فرقہ بندی پیدا ہی باہمی تعصب اور عناد کی بنا پر ہوتی ہے۔ ۴۲/۱۴

یہ تھے فرقہ بندی کے وہ نتائج جن کے متعلق قرآن حکیم نے چودہ سو سال پیشتر ہی یہ سب کچھ واضح کر رکھا تھا لیکن افسوس کہ ہم نے خدا کے اس دیے ہوئے نور سے کوئی راہنمائی حاصل نہ کی بلکہ اس کے برعکس اس قدر جھوٹ بولا کہ وہ سچ نظر آنے لگ گیا اور آہستہ آہستہ فرقہ بندی اور حزبِ اختلاف کا تصور ذہنوں میں کچھ اس طرح پختہ ہوا کہ توحید کے تحت ملت واحدہ کے عملی مفہوم سے پوری امت اسلامیہ محروم ہو کر رہ گئی اور یہ زوالِ ملتِ اسلامیہ پر اسی وقت شروع ہو گیا جب اس کے ہاں خلفاءِ راشدین کے بعد قرآنی احکام پر عمل کروانے والی کوئی مرکزی اتھارٹی باقی نہ رہی۔ وہ مرکزی اتھارٹی جس نے دین اور

دنیا کو یکجا کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس "دورِ جدید میں" دین و دنیا کی ثنویت پیدا کر دی گئی اور ملوکیت نے اپنا کاروبارِ سیاست الگ کرتے ہوئے انسان کو سیاسی طور پر اپنا محکوم بنا لیا اور مذہبی پیشواؤں نے اللہ کے نام پر اسکی الگ دنیا بسالی۔ ملوکیت کے پجاریوں نے انسان کے جسموں پر حکومت کی تھی جبکہ مذہبی پیشواؤں نے بغیر کسی مشینری کے ان کے دلوں پر قبضہ کیا اور انسانی عقل و فکر کو مفلوج کرتے ہوئے گروہ مبدانہ نظریات کے تحت خود ساختہ تصورات کے پردے کچھ اس طرح لٹکائے کہ مرکزِ ملت کی طرف جانے والے تمام راستے آنکھوں سے ہی اوجھل ہو گئے اور سرزمینِ اسلام میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے اس اجنبی پودے کی آبیاری اس طرح کی کہ یہ ایک سایہ فگن پیڑ کی صورت اختیار کر گیا جس کے پتے پتے پر اسبابِ زوالِ اُمت کی تاریخ رقم تھی اور اب حالت یہ ہے کہ اس کی ہر شاخ مفاد پرستی اور عناد پسندی کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے ۔ جہاں تک اس کے پھل کا تعلق ہے یہ دیکھنے میں جاذبِ نظر لیکن ذائقہ میں اتنا ہی ترش اور کڑوا واقع ہوا اور اس کی تاثیر میں سوائے عناد، حسد، بغض، محکومی، محتاجی، خوف و حزن کا زہرِ ہلاہل اور عزتِ نفس کی تباہی، اصول پرستی کی بجائے شخصیت پرستی اور شخصیت پرستی میں پھر انتہا پسندی نتیجتہً سرکشی دل کی پژمردگی، دل گرفتگی اور پریشان خیالی، یاس و ناامیدی، صلاحیت سلبی اور جنگ و جدل کے سوا کچھ اور رکھا ہی نہ تھا لیکن اس کے باوجود کہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا اور ہو رہا ہے، ہم برابر اس کا پھل کھائے چلے گئے اور اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ اس اذیت ناکی سے نہ ہماری نظریں بھرتی ہیں اور نہ ہی پیٹ اور نہ ہی ہم اس دوزخ کی آگ سے نکلنے کی خاطر خالص قرآنی حکومت کے قیام کے لیے عہدِ رفتہ کو آواز دیتے ہیں بلکہ اس کے برعکس کیا تو یہ کیا کہ آنکھوں میں اس قسم کی پژمردگی پیدا کر دی کہ آنے والی نسلوں کو اس برگِ حشیش کے پتے پتے پر اس ذلت آمیزی کی وجہ جواز تک دکھائی نہ دے۔

اس مقصد کے لیے کتنی فقہیں مرتب ہوئیں اور ان فقہوں کی بنیادوں پر کئی فرقوں کا وجود مستقل طور پر قائم کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ یہ بُعد اور یہ دُوری کفر کے فتوؤں تک جا پہنچی (اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) حتیٰ کہ ہر مسجد کی پیشانی پر فرقہ بندی کے بُت کا بورڈ چسپاں کر دیا گیا اور یہ بھول ہی گئے کہ قرآن عظیم نے تو فرقہ پرستی کو شرکِ عظیم قرار دیا تھا۔ ۳۰/۳۱ ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان کتاب اللہ کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت نہ کرتا تو آج نہ کوئی شیعہ ہوتا، نہ سنی، حنفی، نہ دیوبندی، نہ بریلوی، نہ اہلحدیث اور نہ کوئی نقشبندی ہوتا بلکہ سب کے سب ربانی ہوتے۔ اور یہی خدا تعالیٰ کا حکم تھا اور سنتِ رسولؐ بھی۔

قائدِ اعظم اور فرقہ بندی

قائدِ اعظم نے فرقہ بندی اور گروہ بندی کے متعلق قرآنِ حکیم کی عظمت کو کس حد تک جان رکھا تھا، اِس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"صوبہ پرستی ایک لعنت ہے جس طرح مذہبی فرقہ بندی شیعہ سنی وغیرہ بہت بڑی لعنتیں ہیں"

(بحوالہ تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صہ ۸۴)

پاکستان کی ضرورت کیوں؟

اِس اذیت ناک حالت کے باعث ملّت اسلامیہ کے پاس نہ دنیا باقی تھی نہ دین۔ ضرورت تھی کہ اِس کرۂ ارض پر ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھی جائے جس کا تمام کاروبارِ حیات ایک بار پھر قرآن کے ابدی اصولوں پر استوار ہو۔ اور اقبال کے الفاظ میں "میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اِس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اِس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے۔ جو اِس کی تہذیب و تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔" (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

چنانچہ مفکرِ پاکستان علامہ اقبال نے اِس خواب کو دیکھا اور قائدِ اعظم کے ہاتھوں یہ شرمندۂ تعبیر ہُوا۔ لیکن صرف ایک خطۂ زمین کے حصول کی حد تک کیونکہ "شعلۂ عشق سیاہ پوش ہُوا تیرے بعد" اور اس مملکتِ خداداد جس میں قرآنِ حکیم کی حکمرانی قائم کرنی مقصود تھی وہاں اس کے علی الرغم (مسلم لیگ جیسی واحد نمائندہ جماعت کو بھی جسے جلد از جلد ختم کر دیا جانا مقصود تھا) اِسی پاکستان میں ۱۹۷۹ء تک سیاسی جماعتوں کی تعداد ۵۶ تک جا پہنچی۔ ملاحظہ ہو اداریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۹ء اور اس کے بعد اس میں مزید اضافہ ہُوا اور یہ تعداد ۵۶ کی بجائے ۶۴ تک جا پہنچی اور اس کے ساتھ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے ہر مسلم گھرانے اور مسجد میں اسی قرآن کریم کی تلاوت ہوتی رہی اور ہو رہی ہے جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ مسلمانو دیکھنا آپس میں تفرقہ پیدا مت کرنا۔ سچ کہا تھا علامہ اقبال نے ؏

نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

پاکستان میں فرقہ بندی

ہم نے اِس فتح مندی کے لیے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے اِس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل سطور سے لگا سکتے ہیں لیکن اِس مقام پر مَیں یہ عرض کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں کہ اِس سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا جائے گا اِس سے کسی کی بھی تضحیک مقصود نہیں۔ اور نہ ہی کسی کی شخصیت پرستی پیشِ نظر ہے کیوں کہ اگر کسی کی تضحیک جرم ہے تو شخصیت پرستی شرکِ عظیم۔ لہٰذا میرا مقصد صرف حقائق کو بیان کرنا ہے۔ یہ حقائق خود بتا دیں گے کہ ہم نے کیا کچھ نہیں کیا اور کیا کچھ نہیں کہا۔

جب مَیں اپنی موجودہ حالت کو نظر بہ پاکستان کے پس منظر میں دیکھتا ہوں تو زباں پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے ؎

مدّت کے بعد اذنِ تبسّم مِلا مجھے　　وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

جناب مودودی (مرحوم) اور جماعت سازی

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے مودودی صاحب (مرحوم) کی تحریر کا ایک اقتباس پیش ہے — جس سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں میں فرقہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کا وجود کتنا خطرناک اور نقصان دہ ہے، فرماتے ہیں :

" یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اِس جمعیت کے اندر کوئی الگ نام سے مسلمانوں کے درمیان کسی وردی یا ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرنا ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں بلکہ فرقہ بندی ہے، فرقہ پروری ہے اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے طریقے اہلِ مغرب سے لیے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیز دوسروں کے مزاج کے موافق آتی ہے وہ مسلمانوں کے مزاج کے مطابق نہیں آتیں۔"

(بحوالہ خطبات صفحہ ۱۲۸۔ ایڈیشن ۱۹۶۹ء)

لیکن یہ بات ۱۹۴۰ء کی ہے جب مودودی صاحب نے اپنی سیاسی پارٹی قائم نہیں کی تھی۔ اور جب

جماعتِ اسلامی وجود میں آگئی تو پھر پاکستان آنے کے بعد آپ نے یہ بیان جاری کیا:

"جماعتِ اسلامی کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ جماعت کو دوسری پارٹیوں سے کوئی کدورت نہیں لیکن پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔"[1] (بحوالہ نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر کسی قدر ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ جناب مودودی (مرحوم) نے اِس کے ساتھ ایک دوسری جگہ یہ بھی فرمایا کہ:

"آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِس فرقہ بندی سے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ کہنے کو یہ مسلمان ایک اُمّت ہیں مگر حقیقت میں اِس فرقہ بندی کی بدولت اِس اُمّت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اِن کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ اگر آپ اپنی خیر چاہتے ہیں تو اِن بُتوں کو توڑ دیئے۔ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن کر رہیئے اور ایک اُمّت بن جایئے۔ خدا کی شریعت (قرآن) میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی بنا پر اہلحدیث حنفی، دیوبندی، شیعہ اور سنّی وغیرہ الگ الگ اُمّتیں بن سکیں۔ یہ اُمّتیں جہالت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اللہ نے صرف ایک اُمّت، اُمّتِ مُسلمہ بنائی ہے۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

۳۱ علماء کے ۲۲ نکات

لیکن اِس کے ساتھ پھر ہمیں پچھلے پاؤں لوٹنا ہوگا جہاں تاریخ اِس دوسرے رُخ کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۱ء میں ۲۱ تا ۲۴ جنوری کراچی میں تمام فرقوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ۳۱ جیّد علماءِ کرام کا اجتماع ہُوا جن میں خود مودودی صاحب مرحوم کے علاوہ سید سلیمان ندوی مرحوم، مولانا شمس الحق، مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم، مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم، مولانا محمد حسین مرحوم، (جامعہ اشرفیہ) مفتی کفایت حسین مرحوم، مولانا احمد علی مرحوم اور مولانا شمس الدّین فرید پوری مشرقی پاکستان، اب (بنگلہ دیش) جیسے حضرات شامل تھے اور انہوں نے مملکتِ پاکستان کے لیے دستور کی اساس کے پیشِ نظر بائیس نکات پیش کیے اور توقع ظاہر کی کہ اگر ان بائیس نکات کو تسلیم کر لیا جائے تو پاکستان بآسانی اسلامی مملکت بن جائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قدر علمی شخصیات کی حامل ہستیوں نے اہلحدیث، دیوبندی، بریلوی اور

---

[1] پارٹی بازی کے حق میں مزید بیانات کی تفصیل آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

شیعہ جن کا خدا کی شریعت میں کوئی ذکر نہیں اور جنہیں اِس سے پیشتر جہالت کی اتنیں قرار دیا گیا تھا کو ختم کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں۔ میں اِس موقع پر ان مذکورہ بالا ۲۲ نکات میں سے چوتھی (۴) اور نویں شق پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

شق نمبر ۴ میں مذکور ہے کہ :

" اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ کتاب و سُنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے۔ منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و ایما اور متعلقہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔"

شق نمبر ۹ میں اِس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ :

" مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی انہیں پیرؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق ہوگا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے۔ اور ایسا انتظام کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔"

مقامِ حیرت ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم کی بجائے اپنے اپنے پیروؤں کے مسالک کی حکمرانی کے تابع 'اسلامی فرقوں' کی موجودگی میں وہ کون سی 'اسلامی تعلیم' دی جائے گی جو ان سینکڑوں ٹکڑوں کو امتِ واحدہ میں منتشکل کر سکے گی۔ نہ معلوم اس کو خود فریبی کہا جائے یا جہاں فریبی سے تعبیر کیا جائے۔

اِس قسم کے تھے وہ بائیس نکات جن کی تعریف میں ڈاکٹر محمد حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے ایک مضمون بعنوان "اسلامی نظامِ حکومت کا متعین مفہوم" روزنامہ نوائے وقت میں مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۸۳ء کو رقم کیا تھا۔ اور انہیں بائیس نکات کی تعریف روزنامہ جنگ لاہور نے مورخہ ۳ اگست ۱۹۸۴ء کو اپنے اداریہ میں کچھ اس طرح کی کہ :

" مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر (مذہبی فرقوں) کے مابین اتحاد و یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے وحدت امہ کمیٹی نے ایک آٹھ رکنی سب کمیٹی قائم کی ہے جو علماءِ کرام، خطباء اور واعظین کے لیے ایک متفقہ اور قابلِ عمل ضابطہ تیار کرے گی۔ اس سلسلہ میں اگلے روز وحدتِ امہ کمیٹی کا ایک اجلاس صوبائی سیکرٹری

لے ان پر مزید گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔

اوقاف مسٹر آفتاب احمد خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہُوا جس میں تمام مکاتبِ فکر (تمام فرقوں) کے جیّد علمائے کرام نے شرکت کی۔"

اِس کے بعد لکھا ہے:

"امتِ مسلمہ ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے قرآن حکیم کا یہ ارشاد مشعلِ راہ ہونا چاہیئے کہ خدا کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنے اندر تفرقہ پیدا نہ کرو۔" قرآن نے مسلمانوں کو تفرقہ بازی کے نتائج سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ اس طرح دشمن کے مقابلے پر تمہاری ہَوا اُکھڑ جائے گی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی عظمت و شوکت صرف اتحاد اور یک جہتی سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔"

اور اس کے بعد اداریہ نگار نے وحدتِ اُمّہ کمیٹی کی طرف سے تیار کردہ ضابطہ اخلاق کی تیاری کے سلسلہ میں اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"مقامِ مسرّت ہے کہ مذکورہ اجلاس میں علمائے کرام نے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء کے ۲۲ نکات کی بنیاد پر ایک ضابطۂ اخلاق کی تیاری اور اس کی پابندی پر اتفاق کر لیا ہے۔"

راقم اِس اظہارِ مسرّت کے سلسلہ میں اِس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے کہ جن ۲۲ نکات میں بذاتِ خود فرقہ بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا اثر شامل ہو اسے ضابطہ اخلاق قرار دینے اور ان کی پابندی پر اتفاق کرنے کے نتیجہ میں کس قسم کی یک جہتی معرضِ وجود میں آئے گی جس پر یہ داد دی جا رہی ہے۔ اِس قسم کے ضابطہ اخلاق پر تو جس قدر بھی تعزیت کی جائے کم ہے۔

ارشاد احمد حقانی صاحب کی دل سوزی

فرقہ بندی کی بدولت آج ہمارے ہاں کس قدر جذباتی اشتعال پیدا ہو چکا ہے یہ جاننے کے لیے ہمیں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کا وہ کالم دیکھنا ہوگا جو انہوں نے اپنے خونِ جگر کے ساتھ روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۲ مئی ۱۹۸۵ء کے لیے تحریر کیا۔ آپ نے فرمایا:

"ایم آر ڈی کے لیڈر اور سندھ کے ممتاز سیاستدان مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی نے بیرونِ ملک روانہ ہونے سے پہلے ایک بیان میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ سندھ میں مذہبی فرقہ واریت بڑے زوروں پر ہے۔ مختلف مذہبی عناصر ایک

دوسرے کے خلاف نفرت و اشتعال پھیلا رہے ہیں۔ ان کے بقول زہریلے پمفلٹ تقسیم کیے جا رہے ہیں لیکن انتظامیہ اس صورتِ حال کا کوئی نوٹس نہیں لے رہی۔ اور مذہبی منافرت کے اس کاروبار کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کیے جا رہے۔"

جناب حقانی صاحب کے کہنے کے مطابق :

"سندھ میں مذہبی منافرت میں اضافہ اور شدت اور اس کے ناپسندیدہ اثرات و نتائج کی شکایت مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی کی ہے اور کہا ہے کہ بعض دوسرے علاقے اس کی زد میں ہیں۔ کراچی کے بارے میں تو بطور خاص ایک عرصہ سے ایسی اطلاعات آ رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں فقہی مسلک اور عقیدہ کی بنیاد پر آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان اختلافات اور کشیدگی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس ناپسندیدہ اور تکلیف دہ کیفیت کا اثر تو پورے ملک میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کے اثرات بیرونِ ملک بھی پہنچ چکے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ایک عرصہ سے ایسا ہو رہا ہے لیکن کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے اضلاع میں مذہبی منافرت کی فضا خوفناک شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ گذشتہ فروری کے عام انتخابات کے دوران چونکہ سیاسی جماعتوں کو ان میں شرکت کی اجازت نہیں تھی اس لیے جن تعصبات نے ان میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا، ان میں ذات برادری کے علاوہ عقیدہ و مسلک کی بحث نمایاں رہی تھی۔ کراچی میں تو اکثر حلقوں میں کھلم کھلا دیوبندی اور بریلوی اور شیعہ اور سنی کے حوالہ سے انتخابی مہمات منظم کی گئی تھیں اور مسلمانوں کو فرقوں کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بغض میں پختہ تر کرنے کے لیے مذہب ہی کے نام پر زبردست کام لیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کراچی اور سندھ کے دوسرے حصوں میں مذہبی منافرت اور مغائرت پورے عروج پر ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کی ایک بڑی تعداد مذہب اور خدا اور رسولؐ کے نام پر فرقہ واریت کو فروغ دے رہی ہے اور مسلمانوں کو آپس میں بانٹ اور لڑا رہی ہے شیعہ سنی اختلاف پہلے سے موجود ہے اور اس کے تباہ کن اثرات سے ہم ہمیشہ دوچار رہے ہیں۔ ان دنوں شیعہ حضرات اپنے بعض مطالبات کی تکمیل پر زور دینے کے لیے احتجاج اور گرفتاریوں کی ایک مہم منظم کیے ہوئے ہیں اور اسلام آباد کے بعد اب دوسرے مقامات پر بھی گرفتاریاں پیش کی جا رہی ہیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے گذشتہ انتخابات کے موقعہ

پر پنجاب کے بعض اضلاع میں بھی متعدد ایسے فتوے جاری کیے گئے جن میں کسی خاص مذہبی مسلک اور عقیدے کے امیدوار کو ووٹ دینے اور مخالف مذہبی مسلک اور عقیدہ کے امیدوار کو ووٹ نہ دینے کی ہدایت اور تلقین کی گئی اور ایسی تمام اپیلیں مذہب اور خدا اور رسولؐ کے نام پر کی گئیں۔"

اور حقانی صاحب کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

"یہ کیفیت تعلیم یافتہ لوگوں کو اہلِ مذہب اور اس کے نتیجہ میں خود مذہب سے دُور کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ آپ یہ جو اکثر سُنتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگ مذہبی حکومت اور مذہبی ریاست اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی وجہ وہی فرقہ وارانہ سرگرمیاں ہیں جو ہمارے ہاں اِس قدر عام ہوگئی ہیں اور وہ مذہبی تصوّرات ہیں جو فروغ پا رہے ہیں۔"

یہ کیفیت کن حضرات کی پیدا کردہ ہے اِس کے متعلق جناب حقانی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

"اِس میں بڑا قصور ان مذہبی پیشواؤں کا ہے جو فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینا ہی دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں اور جن کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں اور مدّاحوں اور معتقدین کو مسلک اور عقیدہ کے اختلاف میں اس قدر پختہ اور متشدّد کر دیں کہ وہ دوسرے مسلک کے لوگوں کو کافروں سے بدتر سمجھنا شروع کر دیں اور ہو سکے تو ان کے درمیان سماجی و خاندانی تعلّقات بھی منقطع ہو جائیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مذہب کا تذکرہ ایسے انداز میں ہُوا ہے اور ہو رہا ہے۔"

لیکن اس کے باوجود اِن حضرات کو معاشرہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور حقانی صاحب اپنے زیرِ نظر مضمون میں اِس امر کا تذکرہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

"سرکار دربار کی سطح پر مذہب کے مفرط تذکرہ نے مذہبی پیشواؤں کے حوصلوں اور عزائم میں ایک خاص شدّت پیدا کر دی ہے۔ انہیں معاشرہ میں غیر معمولی اہمیّت مل گئی ہے جس کا وہ تعمیری سے زیادہ تخریبی اور اصلاحی سے زیادہ منافرانہ استعمال کر رہے ہیں۔"

اِن حضرات نے نفرت سازی کی فیکٹریاں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں بھی قائم کرنا شروع کر دی ہیں تاکہ آج کی طرح آنے والی نسلیں بھی دنیا کے سامنے سر اُٹھا کر چلنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ لہٰذا بیرونِ ملک سرپھٹول کی یہی وہ کیفیت ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ جنگ لاہور نے اپنے اداریہ مؤرخہ ۲ جون ۱۹۸۵ء کو لکھا کہ:

"فروعی اختلافات اور مذہبی گروہ بندی نے پاکستان میں جو گُل کھلائے ہیں وہی کچھ کم نہیں تھے کہ اب بیرونی ممالک میں بھی بریلوی اور دیوبندی حضرات دست و گریباں ہو کر مذہب اسلام کے لیے تضحیک کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ انگلستان میں جنوبی یارک شائر کے دو شہروں میں ان دونوں گروہوں کے درمیان تصادم کی خبریں آئی ہیں۔ اِس تصادم میں ۱۴ افراد زخمی ہوئے بعض کو شدید چوٹیں آئیں اور اُنہیں ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ انتہا یہ ہے کہ بعض فرقہ پرست علماء انگلستان جا کر باقاعدہ مورچہ بندی کرتے اور اپنے اپنے مسلک کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مخالفین کو طعن و تشنیع سے نوازنے میں معروف رہتے ہیں۔ یہ حضرات تبلیغ کے نام پر بیرونی دورے کرتے ہیں لیکن وہاں جا کر مسلمانوں کے درمیان تفریق و انتشار کے بیج بوتے اور اسلام کو دوسروں کی نگاہوں میں رُسوا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے شہر روتھرم کی مسجد کو حکومت نے محض اِس لیے تالا لگا دیا تھا کہ اندیشۂ نقضِ امن کے تحت ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔"

انتخابی منشوروں میں سیاسی پارٹیوں کا وجود

(انتخابی منشوروں میں فرقہ بندی نیز مختلف راہنماؤں کے بیانات)

قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ "تم اپنے تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو کیونکہ یہی تمہارا سب کا مشترکہ منشور ہے۔" لیکن آج جو اہلِ پاکستان زندگی کے ہر معاملے میں اس قدر ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں تو اس کی بنیادی وجہ اسی حکم سے انحراف ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ہمیں اِس ذہنی انتشار کا اندازہ کچھ عرصہ پیشتر اندرونِ ملک شروع ہونے والی اُس بحث سے بخوبی ہو سکے گا کہ کیا انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں یا غیر جماعتی بنیادوں پر۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ اِس سلسلہ میں چیدہ چیدہ حضرات کے خیالات کو ہی قلمبند کیا جائے "تاکہ آنے والی نسلیں اِس امر کا اندازہ کر سکیں کہ اِس سلسلہ میں ہمارے ان اکابرین کی رائے کیا تھی۔ چنانچہ ان خیالات اور بیانات کو چند صفحات میں یکجا کرنے کا مقصد اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔

سیاسی جماعتوں کا منشور

دسمبر ۱۹۷۰ء میں ملک میں عام انتخابات ہوئے جن میں مختلف سیاسی جماعتوں نے حصّہ لیا۔ ظاہر ہے اِس سلسلہ میں ہر جماعت نے اپنا اپنا منشور مرتّب کر رکھا تھا۔ چنانچہ خالص سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر جو قرآنی تعلیم سے بے بہرہ تصوّر کی جاتی تھیں، دیکھنا یہ ہے کہ اسلام پسند جماعتوں نے اس فرقہ بندی کو ختم کرنے کے لیے کیا تدابیر تجویز کیں لیکن افسوس کہ ہر "اسلام پسند جماعت" نے خواہ وہ جماعتِ اسلامی ہو اور خواہ کُل پاکستان جمعیت اسلام (مفتی محمود مرحوم صاحب کی پارٹی) ہر ایک نے اپنے اپنے منشور میں یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو اِن بائیس نکات کو مملکتِ پاکستان کے دستور کی اساس بنا دیں گے یعنی اُن بائیس نکات کو جس میں شق نمبر ۴ اور شق نمبر ۹ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

قومی اتحاد کا منشور

۱۹۷۰ء کے بعد ۱۹۷۷ء میں ملکی سطح پر ایک بار پھر عام انتخابات کا دَور آیا اس وقت سب سے اہم سطح پر قومی اتحاد کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان حضرات کا تو نعرہ ہی نظام مصطفےٰ کا قیام تھا اور اس کے سربراہ (مفتی محمود[۱] صاحب مرحوم) تھے لیکن اِن حضرات نے بھی اجتماعی طور پر اس فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے اِس موذی مرض کو ختم کرنے کے لیے کوئی فارمولا ملّت کے لیے تجویز نہ کیا جبکہ اس کا بہترین علاج تو یہ تھا کہ دین اور دنیا کی ثنویت کو ختم کرنے کی خاطر ان مذہبی فرقہ بندی کے گہواروں (یعنی مذہبی دار العلوموں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرتے ہوئے اس کی جگہ قرآنی تعلیم کا مشترکہ نصاب سکولوں اور کالجوں میں رائج کرنے کا کوئی پروگرام قوم کے سامنے رکھا جاتا تاکہ اُمّتِ واحدہ کے تصوّر کو عملی تشکل دی جا سکتی۔ لیکن یہ کچھ نہ پہلے ہُوا اور نہ اب بلکہ اِس کے برعکس انہوں نے کہا تو یہ کہا کہ "دینی (دار العلوموں اور) مدارس کو قومی تحویل میں نہ لینے کی ضمانت دی جائے گی" (بحوالہ منشور پاکستان قومی اتحاد صفحہ نمبر ۱) بالفاظ دیگر اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو ہر فرقہ کی غیر قرآنی فرقہ بندی کے تصوّر کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے انہیں قانونی حیثیت دی جائے گی۔

ع خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

۱۔ مفتی محمود صاحب مرحوم، سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کے عہدے پر بھی فائز کر دیئے گئے تھے۔

CamScanner

ان مدارس اور دارالعلوم کے متعلق مولانا فضلِ حق صاحب نے اپنے مضمون "قرآن کا سفر" میں لکھا تھا کہ:

"بین الاقوامی سرحدوں کو نظر انداز کر کے آپ پشاور سے ترچناپلی تک بس یا کار میں سفر کریں تو جہاں آپ کو مناظر ارضی اور آب و ہوا کی نیرنگیاں نظر آئیں گی وہاں مسلمان آبادیوں میں آپ کو دارالعلوموں کے رنگا رنگ سائن بورڈ بھی ملیں گے ایک قرآن کے ہزار مکتب اور مدرسے کوئی حنفیہ کوئی چشتیہ اور کوئی صرف قرآنیہ اور حقانیہ۔ ان مدرسوں کے بانی یقیناً نیک نیت اور مخلص لوگ گزرے ہوں گے اور ان کی کاوش کا مقصد نورِ بصیرت کو عام کرنا ہی ہوگا۔ لیکن آدمی فانی اور وراثت زمانی ہے۔ بات جب وراثتوں تک پہنچی تو یہ مراکز اشاعتِ قرآن کے ساتھ ساتھ حصولِ دنیا، فروغِ سیاست، اور کسبِ رزق کے ذریعے بن گئے۔ اصل مقصد پہلے پس منظر میں گیا پھر بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء)

نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

دارالعلوموں کی اِس حقیقتِ حال کے بعد پارٹی بازی کے سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے جماعتِ اسلامی نے کہا تھا: "اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیوں کی پوری گنجائش موجود ہے۔" نیز انہوں نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ "جن جماعتوں نے قرآن و سنت کی بنیاد پر اپنے منشور تیار کیے ہیں انہیں فی الفور بحال کر دیا جائے اور جو جماعتیں پاکستان کی اساس کی مخالف ہیں انہیں ہرگز پنپنے کا موقع نہ دیا جائے" (بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۳ء) بلکہ ۱۹۶۲ء کی قومی اسمبلی نے ایک طویل اجلاس کے بعد جب سیاسی پارٹیوں کے احیا اور تشکیل سے متعلق بِل پاس ہُوا تو جماعتِ اسلامی کے امیر جناب مودودی مرحوم نے اس وقت فرمایا تھا کہ "سچ پوچھیے تو ملک میں سیاسی جماعت بنانے کا سب سے زیادہ حق اب ہمیں حاصل ہو گیا ہے باقی جماعتیں تو رعایتاً اِس امر کی مجاز ہوں گی کہ اپنی الگ تنظیم کریں۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء۔ طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۶۲ء)

کالعدم جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کی ۴۲ یوم تاسیس کے موقع پر فرمایا "جو لوگ سیاسی جماعتیں ختم کر دیں وہ اسلامی نظام کیسے منظور کر سکتے ہیں" اور مزید کہا:

"صحابہ نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں۔ اِس لیے مسلمانوں کے اندر جماعت کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔" (بحوالہ جنگ لاہور مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۸۲ء)

یعنی معاذ اللہ صحابہ کرام رضؓ قرآن کی اس آیت کو بھی نہ سمجھ سکے کہ فرقے اور پارٹیاں بنانے والوں کا خدا کے رسول ﷺ کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔" ۶/۱۶۰۔

جہاں تک صحابہ کرام رضؓ کا آپس میں جماعتیں بنانے کا تعلق ہے، اِس سلسلہ میں شاید میاں صاحب کو علم نہیں کہ مودودی صاحب (مرحوم) اس سے پہلے فرما چکے تھے کہ "نبی اکرم اور خلفائے راشدین رضؓ کے زمانے میں تمام مسلمان ایک ہی پارٹی تھے۔" (بحوالہ نوائے وقت ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

میاں طفیل صاحب کے بعد جہاں تک ۱۹۸۵ء کے ضمنی انتخابات میں نو منتخب ممبر سید اسعد گیلانی کا تعلق ہے تو آپ نے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک اجتماع میں فرمایا کہ:

"اگر سیاسی جماعتوں کو بحال نہ کیا گیا تو کالعدم جماعتِ اسلامی خود ایک تاریخ مقرر کرے گی اور اس تاریخ کے ۲۴ گھنٹے کے اندر جماعتِ اسلامی کو بحال کر دینے کا اعلان کر دیا جائے گا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۸۵ء)

اور قومی اسمبلی کے رکن ایئر مارشل ریٹائرڈ نور خاں نے کہا کہ: "سیاسی جماعتوں کو آزادی دیئے بغیر جمہوریت نہیں چل سکتی۔" (روزنامہ جنگ لاہور ۲۱ مئی ۱۹۸۵ء)

جماعتِ اسلامی کے شیخ التفسیر مولانا گوہر الرحمان کا فرمان یہ ہے کہ "اسلام میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں پر کوئی پابندی نہیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۳ء)

پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا منظور احمد چنیوٹی نے جنگ فورم میں انٹرویو کے دوران فرمایا کہ "تمام سیاسی جماعتوں کو بحال کر دینا چاہیئے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ دسمبر ۱۹۸۵ء)

نظریاتی کونسل کی رپورٹ

کچھ عرصہ پیشتر اسلامی نظریاتی کونسل نے پاکستان میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں ۸۶ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ بھی تیار کی تھی جس میں رائے ظاہر کی گئی کہ غیر جماعتی انتخابات بہتر رہیں گے۔ اس سلسلہ میں مختلف حضرات کے بیانات اور انٹرویوز اخبارات میں شائع ہوئے چنانچہ کالعدم جماعتِ اسلامی کے مرکزی رہنما اور سابق وفاقی وزیر پروفیسر غفور احمد صاحب نے فرمایا "ہم نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ اگر عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے گئے تو یہ ملک کے لیے

نقصان دہ ہوگا۔" (بحوالہ نوائے وقت میگزین ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء) اس کے علاوہ اسی جماعت کے نائب صدر مولانا جان محمد عباسی نے فرمایا: "غیر جماعتی بنیاد پر تو کوئی سیاسی عمل ہی ممکن نہیں۔"

(بحوالہ نوائے وقت میگزین مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اور اگر اس سلسلہ میں مولانا کوثر نیازی صاحب سابق وفاقی وزیر مذہبی امور کا وہ کالم دیکھا جائے جو انہوں نے بعنوان "سیاسی جماعتیں اور اسلام" کے تحت روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو رقم کیا تو وہ بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے دکھائی نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ:

"سیاسی جماعتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ کہ ان کا وجود خلافِ اسلام ہے جبکہ نبی اکرمؐ کے زمانے کے قبائل ہی موجودہ سیاسی جماعتوں کا بدل تھے اور ہر قبیلہ اپنی اپنی جگہ ایک مضبوط سیاسی جماعت کی حیثیت رکھتا تھا۔[1] پھر اللہ کے رسولؐ نے سیاسی جماعتوں کے قیام کی مخالفت بھی نہیں کی۔[2] پھر مزید فرمایا کہ "موجودہ سیاسی جماعتوں کے قیام کو غیر اسلامی قرار دے دینا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔"

۱۹۸۵ء کے عام ملکی انتخابات سے قبل مولانا کوثر نیازی صاحب جو کالعدم پروگریسو پیپلز پارٹی کے چیئرمین ہیں، پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ:

"مجھے خوشی ہے کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے آخر کار نظریاتی بحث ترک کر دی ہے جس میں ان کے خیال کے مطابق اسلام میں سیاسی جماعتوں کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ نقطۂ نظر بالکل غلط تھا۔ قرآن پاک میں اچھے مقصد کے لیے جماعت سازی کا حکم موجود ہے۔ خود رسالت اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مختلف منظم گروہ موجود تھے اور بعض قبائل کا تشخص تسلیم کیا جاتا تھا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۸ نومبر ۱۹۸۳ء)

خان محمد اشرف خان صاحب سربراہ کالعدم خاکسار تحریک پاکستان نے فرمایا:

"غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ارکان اسمبلی میں جا کر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے نت نئے گروپ بناتے اور توڑتے رہیں گے۔ ایسی حکومت بھی مستحکم نہیں ہوگی۔ انتشار کا

---

[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی قبیلوں کو امت واحدہ کا تصور پیش کیا تھا تاکہ قبائلی سطح کی سیاست گری باقی ہی نہ رہے بلکہ سب کے سب خدا کی ایک پارٹی میں شامل ہو جائیں۔

[2] کس قدر بہتان ہے رسولِ خدا پر حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی اپنی مفاد پرستی کسی کو بھی معاف نہیں کرتی۔

شکار رہے گی۔ ذاتی اغراض پرورش پائیں گی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ راگست ۱۹۸۳ء)

مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب جنرل سیکرٹری کالعدم جمعیت العلمائے پاکستان نے فرمایا:

"روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں جہاں غیر جماعتی انتخابات ہوتے ہوں۔ اِس سے نسلی قومیت، وطن، علاقائیت، زبان اور رنگ کے تعصبات اُبھریں گے اور ملکی سلامتی کے لیے زہرِ قاتل۔ (لہٰذا) جماعتی بنیادوں پر انتخابات سے پاکستان کی وحدت و استحکام حاصل ہوگا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ ۶ راگست ۱۹۸۳ء)

پھر نومبر ۱۹۸۳ء میں مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات ملکی مفاد کے منافی ہیں (کیونکہ) اِس سے علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصبات پیدا ہوں گے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۶ نومبر ۱۹۸۳ء)

کے۔ ایچ خورشید سابق صدر آزاد کشمیر نے فرمایا "پارلیمانی نظام اور پارٹی سسٹم کے بغیر نہ عوام کی ترجمانی ہوسکتی ہے اور نہ عوام کا کردار ابھر سکتا ہے۔"

فتحیاب علی خاں مزدور کسان پارٹی کے رہنما نے فرمایا "میں غیر جماعتی انتخابات کو نامناسب سمجھتا ہوں۔ غیر جماعتی انتخابات سے پاکستان کا مستقبل متاثر ہوگا۔" (ایضاً)

ملک قاسم جنرل سیکرٹری مسلم لیگ خیرالدین گروپ نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات کے ملک پر اچھے اثرات مرتب نہیں ہوں گے اِس سے برادری سسٹم فروغ پائے گا۔" (ایضاً)

نفیس صدیقی سابق مرکزی سیکرٹری اطلاعات تحریکِ استقلال نے فرمایا: "غیر جماعتی انتخابات میں ہر شخص مسائل کو اپنے طریقے سے حل کرنا چاہے گا۔ یہ ملک و قوم کے لیے خطرناک ہوں گے۔" (ایضاً)

ریٹائرڈ جسٹس شوکت علی ایک ممتاز سیاسی رہنما نے فرمایا: "غیر جماعتی انتخابات کسی بھی لحاظ سے سودمند نہیں ہوسکتے۔ جماعتی انتخابات ملکی سالمیت کی ضمانت فراہم کرسکتے ہیں۔" (ایضاً)

جناب مسٹر جسٹس شوکت علی صاحب نے سیاسی جماعتیں اور انتخابات کے سلسلہ میں مزید فرمایا: "اگر ہم نے غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات کی بنیاد رکھ دی تو ملک چھوٹی چھوٹی برادریوں میں بٹ جائے گا اور ایک پاکستانی قومیت کا تصور بالکل ختم ہوجائے گا جس سے پاکستان کی سلامتی اور بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۸۳ء)

نواب اکبر بگٹی سابق گورنر بلوچستان: "غیر جماعتی انتخابات سے ترقی کی رفتار رُک جائے گی اور

گروہ بندی ہوگی۔" (ایضاً)

خورشید حسن میر، سربراہ کالعدم عوامی جمہوری پارٹی نے فرمایا: "غیر جماعتی انتخابات کہاں اور کس ملک میں ہوتے ہیں اس سے ہر شخص برادری کی بنیاد پر اسمبلی میں آئے گا۔ ایک فرد کی معاشی پالیسی کیا ہوگی خارجہ پالیسی کیا ہوگی۔ صوبائی خود مختاری کے مسئلے پر اس کا موقف قومی نوعیت کا کیسے ہوگا وہ نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہوگا نہ کسی ضابطہ کا پابند۔" (ایضاً)

خواجہ خیر الدین، صدر مسلم لیگ (خواجہ خیر الدین گروپ) نے فرمایا: "غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے نتیجے میں منتخب ہو کر اسمبلی میں جانے والے افراد اپنے علاقے کی بات کریں گے ملک کی نہیں۔" (ایضاً)

میر غوث بخش بزنجو، سربراہ پی این پی نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات جمہوریت کا حصہ نہیں ہیں ایسے افراد جس طرح چاہیں گے سودے بازی کریں گے۔

زین العابدین قائمقام صدر کالعدم پی ڈی پی نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات سے عجیب قسم کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور ہم بہت پیچھے چلے جائیں گے۔" (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۶ اگست ۱۹۸۳ء)

جمعیۃ علمائے پاکستان کا انتخابی منشور

جمعیۃ علمائے پاکستان کا انتخابی منشور جس کا نام ہی "اسلامی منشور" تھا اگر اسے دیکھا جائے تو اس کے صفحہ ۲۰ پر یہ پروگرام ملے گا:

"پاکستان کی مجلس شوریٰ (اسمبلیوں) وغیرہ میں نمائندگی کے لیے انتخابات کا نظام شخصی مقابلہ کے بجائے جماعتی مقابلہ پر قائم کیا جائے گا اور افراد کی بجائے جماعتیں اپنے منشور و پروگرام کی اساس پر انتخابات میں حصہ لیں گی اور فی صد کامیابی کے تناسب کے مجالس شوریٰ کی رکنیت کی حقدار بنیں گی اور تشکیل حکومت کریں گی۔"

نیز کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے صوبائی کنونشن جو جامعہ نعیمیہ لاہور میں پیر سید برکات احمد کی صدارت میں مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوا ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ "سیاسی جماعتوں پر رجسٹریشن کی پابندی عائد نہ کی جائے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۴ نومبر ۱۹۸۵ء) بالفاظ دیگر ان کی باگ ڈور بھی کسی ادارہ کے ہاتھ میں نہ ہو۔

کالعدم جمعیت العلمائے پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل شاہ فرید الحق جنگ فورم میں کہتے ہیں: "انتخابات جماعتی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔"

جہاں تک جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کا تعلق ہے تو آپ نے ایک انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہمارا مؤقف یہ ہے کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو عام انتخابات میں حصّہ لینے کا حق حاصل ہو۔" اور جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا جمعیت علمائے پاکستان عام انتخابات میں کسی سیاسی جماعت سے انتخابی اتحاد کرے گی تو کہا "نہیں۔ ہماری یہی سوچی سمجھی رائے ہے کہ انتخابی اتحاد مفید نتائج پیدا نہیں کرتا اس لیے جمعیت انتخابی اتحاد نہیں کرے گی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین صـ۴ مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

اور ایس۔ ایم ظفر سابق وفاقی وزیر قانون نے انتخابات کے سلسلہ میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

"سیاسی جماعتوں کا تجربہ انسانی فکر کا ایک نیا تجربہ ہے اور تمام مملکتیں سیاسی جماعتوں کے ذریعے ہی حکومت چلا رہی ہیں اس لیے اس مفید فکری ایجاد سے گریز مناسب نہیں۔" پھر فرمایا: "آخر گھڑی کی سوئی کو پچھلی جانب گھمانے کا شغل بے کار کیوں اپنایا جائے، کیوں نہ آگے بڑھ کر بیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئی راہیں اختیار کی جائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سیاسی جماعتوں کے بننے اور ان کی نشوونما میں رکاوٹ بننے کی بجائے حکومت ان کی مددگار بنے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اور جاذب سہیل نمائندہ جنگ لاہور نے ایک ملاقات کے دوران محمد بخش مسلم سے جب سوال کیا کہ: "جب انتخابات جائز ہیں تو کیا اسلام میں سیاست اور سیاسی پارٹیوں کی گنجائش ہے؟" تو آپ نے فرمایا:

"قائدِ اعظم۔ لیاقت علی خاں بھی ایک سیاسی پارٹی سے منسلک تھے۔ جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت العلمائے اسلام، مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کیا ہیں۔ آخر جماعتیں ہی تو ہیں۔ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی گنجائش ہے۔ کون کہتا ہے نہیں ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور جمعہ میگزین ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

مولانا محمد بخش مسلم کے اس سوال کا جواب "کہ کون کہتا ہے کہ اسلام میں پارٹیوں کی گنجائش نہیں" سوائے اس کے اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ ہمارا خود ساختہ اسلام تو یقیناً اس کی اجازت دیتا ہے لیکن خدائے واحد کی طرف سے نازل کردہ ضابطہ حیات میں تو کہیں بھی اس کی گنجائش نہیں۔ افسوس

---

۱ قائدِ اعظم کی مسلم لیگ کو ختم کرنے کی بات آئندہ صفحات پر سامنے آئے گی۔

یہ ہے کہ ہم اپنی بات کو مؤثر ثابت کرنے کے لیے اور دوسروں سے منوانے کے لیے بڑی جرأت کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام نے یہ کہا اور شریعت کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔ اگر یہ حضرات اسلام اور شریعت کی غیر متعین اصطلاح کی بجائے قرآن حکیم کا لفظ استعمال کریں تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ حضرت یہ بات قرآن حکیم کے کس مقام پر درج ہے۔ اس نے تو پورے قرآن میں امت واحدہ کی تعلیم دی ہے اور یہی ہمارا آئیڈیل نظام ہے ـــــ اس کے بعد ایک اور قابلِ غور اور دلچسپ انٹرویو ملاحظہ فرمائیں۔

جناب محترم جاذب سہیل صاحب نے اپنی ان تمام اخباری ملاقاتوں کے دوران مجلس شوریٰ کے رکن اور جمعیت اہلحدیث کے رہنما میاں فضل حق صاحب سے انٹرویو لیتے ہوئے جب یہ سوال کیا کہ "صاحب یہ بتا دیجئے کہ سیاسی پارٹیوں کے وجود کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟" تو آپ نے فرمایا:

"سیاسی پارٹیاں نظامِ حکومت چلانے کے لیے معرضِ وجود میں آسکتی ہیں۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔"

آپ کا دوسرا سوال یہ تھا کہ "پھر یہ بتا دیجئے کہ آپ انتخابات جماعتی بنیادوں پر پسند کرتے ہیں یا غیر جماعتی بنیاد پر؟" تو آپ نے جواب دیا:

"یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ آپ اجتماعی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، خوب جانتے ہیں کہ اس وقت ملک میں کتنی جماعتیں ہیں۔ ۸۰ سے زائد ہیں۔ صرف بڑی جماعتوں کو شمار کیا جائے تو وہ بھی دس سے زیادہ ہیں۔ جب یہ ملک بنا تھا تو اس وقت کتنی جماعتیں تھیں، صرف ایک اور پورے برِ صغیر میں ایک نظریئے کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس نے پاکستان جیسا بڑا مقصد حاصل کیا۔ اب ڈھیر ساری جماعتیں کیا کریں گی؟ منتخب ہو کر وزارتوں کی تقسیم ہوگی۔ باہمی کشمکش کو فروغ ملے گا، ذاتی مفادات پر جھگڑے ہوں گے۔ اس طرح یک جہتی اور اتحاد کے جذبات پروان نہیں چڑھ سکیں گے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات کرائے جائیں۔ ایسے انتخابات کے نتیجے میں اتحاد کو فروغ ملے گا۔"

س: جب آپ سیاست اور دین کو الگ قرار نہیں دیتے، سیاسی پارٹیوں کے عمل کو اسلام کے خلاف نہیں کہتے تو جماعتی انتخابات کے خلاف چہ معنی دارد؟

ج: ہمیں حکم ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو (القرآن) جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ہمارا

دین ہے، اسلام ہماری سیاست ہے تو پھر زیادہ جماعتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

س: میرا یہ سوال ابھی تشنۂ جواب ہے کہ اگر علمائے کرام ایک پارٹی نہیں بنا سکتے تو سیاسی پارٹیوں کی تعداد پر اعتراض کیوں؟"

ج: علماء فقہی طور پر جداگانہ مسالک رکھتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے کوئی شوریٰ میں اختلاف نہیں رکھتا۔ یعنی فقہی لحاظ سے جو اختلاف پائے جاتے ہیں ان کی زد میں نہ زکوٰۃ آتی ہے، نہ عشر، نہ شراب کی تعریف آتی ہے، نہ وراثت کے سلسلہ میں وصیت، نہ چوری کے معاملہ میں ہاتھ کاٹنے پر اختلاف ہے، نہ زمین کی بٹائی اور مزارعت نہ سنت کی تعریف متضاد ہے، نہ قرآن کی تفسیر اور تراجم متضاد بلکہ ان تمام علمی، سماجی، سیاسی عدلی اور تعزیری نظام اور تعلیم پر مکمل اتفاق ہے۔[1]

... اس کے بعد موصوف نے ۳۱ علماءِ کرام کے مرتب کردہ ان ۲۲ نکات پر سوال اُٹھایا جس پر راقم اس سے پہلے تبصرہ کر چکا ہے۔ سوال تھا کہ "کیا حکومت نے ۲۲ نکات کا فارمولا تسلیم کر لیا ہے جواب یہ تھا "کر لیا ہے"۔ اس کے بعد پوچھا گیا کہ "کیا اس کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے؟" تو آپ نے فرمایا "بائیس نکات کے رہنما اصولوں کے مطابق یقیناً عمل ہوگا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین صفحہ ۶ مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

یعنی فرقہ بندی کی گرہوں کو مضبوط کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ تعلیمی ادارے ضرور قائم ہوں گے۔

اے کاش کوئی اللہ کا بندہ ان سوالات اور ان بیانات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

قرآنِ حکیم نے سچ کہا تھا کہ "اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں بہت سارا اختلاف ہوتا" ۴/۸۲

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (جو مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہ چکے ہیں) ان کا خصوصی انٹرویو روزنامہ جنگ کی ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ انٹرویو کے دوران آپ سے سوال کیا گیا کہ "کیا آپ سیاسی پارٹیوں کی بحالی کے حق میں ہیں؟" تو آپ نے جواب میں فرمایا:

---

[1] اہلِ علم حضرات خوب جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

"میں اِس کے حق میں ہوں کہ اِس کے بغیر یہاں کوئی نظام نہیں چل سکتا لیکن کُل پاکستان سطح پر گریجویٹڈ اسمبلی یا منتخب مجلس شوریٰ کی میری تجویز ہے۔ میں اس کے لیئے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے حق میں ہوں۔"

آپ کے اِس جواب پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اور جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ "جب سیاست اور دین جداگانہ چیزیں نہیں ہیں تو پھر سیاسی پارٹیوں کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا:

"(۱) ہمارا آئیڈیل نظام تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قائم کردہ نظام ہے جو خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی قائم رہا۔ میرے نزدیک وہ نظام غیر جماعتی یا ایک جماعتی نظام تھا کسی سیاست کا وجود نہیں تھا۔ تاہم موجودہ حالات میں سیاسی جماعتوں کے رول کے لیے گنجائش پیدا کرنی پڑے گی۔

(۲) بنیادی طور پر دین اس کے خلاف نہیں ہے۔"

جب آپ سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا سیاسی پارٹیاں دینِ اسلام کے خلاف نہیں ہیں؟" تو آپ کا جواب تھا کہ:

"جی نہیں۔ میرے نزدیک سیاسی جماعتیں اپنے منشور کے ساتھ عوام کے سامنے آئیں۔ ان کو انتخابات میں حصہ لینے کی کھلی اجازت ہو لیکن حکومت کی تشکیل کے بعد میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں آزادانہ اور اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کا حق دینا چاہیئے۔ پارٹی کی رائے کے مطابق ہی چلنے کی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔"

یعنی ہمارا آئیڈیل نظام تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ ہے جس میں کسی سیاسی پارٹی کی گنجائش نہیں لیکن اسلام اِس آئیڈیل نظام کے خلاف اجازت بھی دیتا ہے۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

اسلامی نظریاتی کونسل میں سیاح الدین کاکاخیل نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"غیر اسلامی دستور و منشور والی سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں شرکت کا حق نہ دیا جائے اور اسلامی دستور و منشور والی سیاسی جماعتوں کو موقع دیا جائے کہ ان کے ذریعے دستورِ پاکستان کے مقاصد کو حاصل کیا جائے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ادارتی صفحہ ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء)

آزاد کشمیر کے صدر جناب عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا:

"بگڑے ہوئے حالات صرف سیاسی جماعتیں ہی سنوار سکتی ہیں۔ اگر حالات مخدوش ہو جائیں تو انہیں ختم کرنے کے لیے بھی سیاسی جماعتیں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

کالعدم قومی محاذ آزادی کے قائم مقام صدر اقبال حیدر نے کہا:

"غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات حکومت کو استحکام دینے کے مترادف ہیں" نیز آپ نے فرمایا کہ اس طرح حکومت عوام کو جماعتی اور غیر جماعتی انتخابات میں الجھا کر ملک میں آمریت نافذ کرنا چاہتی ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

تحریکِ اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد نے کہا کہ "غیر جماعتی انتخابات سے ملکی سلامتی کو نقصان پہنچے گا۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

ممتاز سیاسی دانشور اے کیو ایم شفیق الاسلام سابقہ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اور سیکرٹری اطلاعات نے روزنامہ جنگ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کے حوالے سے فرمایا:

"مارشل لاء کا ختم ہونا بھی ضروری ہے اور انتخابات جماعتی بنیادوں پر کرانا بھی لازم ہے۔ غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات تباہ کن نتائج کے حامل ہوں گے جس سے ملک کو انتشار اور ایک نئے بحران کے سوا کچھ نہ ملے گا۔"

پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب مسٹر جسٹس شیخ انوار الحق نے جناب سہیل صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو کے دوران ایک سوال (کہ کیا انتخابات سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر ہونے چاہئیں یا غیر جماعتی بنیاد پر) کے جواب میں فرمایا:

"اِس کے بارے میں تفصیلی رائے کا اظہار سیاست دان کر سکتے ہیں۔ مَیں سیاستدان نہیں ہوں۔ البتہ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے میری ذاتی رائے ہے کہ انتخابات جماعتی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ پاکستان ایک سیاسی جماعت کی جدّوجہد کے نتیجے میں بنا ہے، اِس کی بنیاد سے انحراف ٹھیک نہیں۔ غیر جماعتی بنیادوں پر جو افراد اسمبلیوں میں جائیں گے وہ کوئی مشترکہ مؤقف کس طرح اختیار کریں گے۔ ان کا منشور کیا ہو گا۔ وہ قومی اور عالمی پالیسیوں کے بارے میں کیا رائے دے سکیں گے۔ انفرادی طور پر کوئی شخص کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس کی اجتماعی سوچ کیا ہو سکتی ہے البتہ سیاسی

پارٹیوں کو نظریہ پاکستان، ملکی وحدت کی سالمیت، اور مسلمہ اسلامی اقدار کا پاسدار بنایا جاسکتا ہے۔ الیکشن کمشن کو اپنے طور پر ایسی پارٹیوں کے بارے میں چھان بین کرنی چاہیئے۔ جس پارٹی کو وہ مسلّم اصولوں کے خلاف سرگرم پائیں اس کو الیکشن میں حصّہ لینے سے روک دیں۔ لیکن اس صورت میں پارٹی کو اپنی پوزیشن صاف یا واضح کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء)

جناب حنیف رامے سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے فرمایا کہ:

"سیاسی جماعتوں پر عائد پابندیاں ختم کرکے انتخابات کرائے جائیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۸۳ء)

پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ جناب آغا شاہی نے جنگ فورم کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ: "میں اصولاً سیاسی جماعتوں کو کردار ادا کرنے کا موقع دینے کے حق میں ہوں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۸۴ء)

نواب زادہ نصراللہ خاں صاحب نے فرمایا کہ

"سیاسی جماعتوں نے وطن کی سالمیت کے لیے ہر آڑے وقت میں مؤثر کردار ادا کیا ہے اس لیے غیر جماعتی انتخابات سے وجود میں آنے والے ادارے کو کوئی لائق احترام نہیں سمجھے گا۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۸۴ء)

وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو

اور بالآخر ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے بعد پاکستان کے وزیرِ اعظم جناب محمد خان جونیجو نے فرمایا کہ:

"سیاسی جماعتوں کو بحال ہونا چاہیئے۔" آپ نے مزید فرمایا کہ "سیاسی جماعتوں کی بحالی تک ..... گروہ بندی سے گریز کرنا ہوگا۔" (بحوالہ روزنامہ مشرق لاہور مورخہ ۲۴ مارچ ۸۵ء)

(نیز) وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو نے اسلام آباد میں مسلم لیگ پارلیمانی گروپ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ "کوئی بھی حکومت کسی منظم سیاسی جماعت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اس لیے موجودہ حکومت نے اپنی سیاسی جماعت تشکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ گذشتہ اجلاس کے دوران بعض ارکان

نے فلور کراسنگ کی شق کے حوالے سے یہ تاثر قائم کیا تھا کہ شاید ہم ان پر کوئی پابندی عائد کر رہے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔

فخر امام

وزیرِ اعظم جناب جونیجو نے جو کچھ کہا ہے قومی اسمبلی کے سپیکر جناب فخر امام نے بھی اگلے روز انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جدید سیاسی نظام جماعتوں کے بغیر نہیں چل سکتا غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والی اسمبلی نے اب تک کافی کام کیا ہے لیکن طویل عرصہ تک سیاسی جماعتوں کے بغیر اِس نظام کا چلنا ممکن نہیں۔" (بحوالہ اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۹ ستمبر ۸۵ء)

اور جہاں تک سینٹ کی سیاسی کمیٹی کے چیئرمین جناب فدا محمد خاں کا تعلق ہے تو آپ نے روزنامہ نوائے وقت سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا کہ: "سیاسی پارٹیوں کی بحالی کے بعد ان کی تعداد میں کمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ۳۰ جولائی ۸۵ء)

اور اِس کے بعد اگست ۱۹۸۵ء میں قومی اسمبلی کی ۲۹ رکنی خصوصی سیاسی کمیٹی نے آئندہ سیاسی نظام کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق:

قومی اسمبلی کی سیاسی کمیٹی کی رپورٹ

"ایسی کوئی سیاسی جماعت قائم نہیں ہونی چاہیئے جس کا مقصد کسی ایسی رائے یا نظریہ کا پرچار اس انداز میں کرنا ہو جس سے اسلامی نظریے، پاکستان کی خود مختاری، سالمیت، اخلاقیات یا امن و امان کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸ اگست ۱۹۸۵ء)

روزنامہ جنگ لاہور کا اداریہ

صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر پارٹی بازی کے انتشار اور نقصانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مملکتِ پاکستان میں عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کروانا چاہتے ہیں تو روزنامہ جنگ لاہور نے ۶ نومبر ۱۹۸۴ء کو اداریہ سپردِ قلم کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اہم حصہ یہاں درج کر دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہماری سوچ کا رُخ کیا ہے۔

"صدر ضیاء الحق نے ایک بار پھر کہا ہے کہ وہ صرف پہلے عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کرانے کے خواہشمند ہیں۔ ان کی اِس خواہش کا اظہار مجلس شوریٰ کے ابتدائی اجلاس میں ان کے افتتاحی خطاب کے دوران بھی ہو چکا ہے تاہم ان کی اِس خواہش کے باوجود پاکستان میں جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے انعقاد کی ملک میں تمام سیاسی مکاتبِ فکر کی جانب سے بدستور حمایت کی جا رہی ہے اور ہم اِس ضمن میں ان ہی کالموں میں ایک سے زیادہ بار جماعتی بنیاد پر عام انتخابات کے انعقاد کی افادیت پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ صدر ضیاء الحق نے اِس ضمن میں چونکہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا اور انہوں نے کبھی کسی معاملے کو اپنی ذاتی اَنا کا مسئلہ نہیں بنایا ہے اِس لیے ہم ان سے مکرر گزارش کریں گے کہ وہ عام انتخابات کے معاملے میں مجلس شوریٰ اور ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے جذبات و احساسات ہی کو مقدم جانیں اور تمام محبِ وطن سیاسی جماعتوں کو اس میں شرکت و شمولیت کا موقع فراہم کریں۔

جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے انعقاد کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ کسی سیاسی حلقے کو ان میں شرکت پر اعتراض نہیں ہوگا اور اگر کسی ضمن میں کسی کالعدم سیاسی جماعت کی جانب سے ان میں عدمِ شرکت کا فیصلہ کیا جائے گا تو عوام الناس کی نگاہ میں اِس فیصلے کی ذمہ داری متعلقہ کالعدم سیاسی جماعت کے سر پر رہے گی اِس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ کالعدم سیاسی جماعتوں کے صفِ اوّل کے رہنما صوبائی اور قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصّہ لے سکیں گے اور اس طرح جو طبقہ ان انتخابات کے نتیجے میں اسمبلیوں میں پہنچے گا اس کی صلاحیت، کارکردگی، تدبّر اور تجربہ غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والے ارکان سے کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ رائے دہندگان رائے دیتے وقت سیاسی جماعتوں کے منشور اور پروگرام کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ برادری اور پیشہ کے نقطۂ نگاہ سے نہیں قومی نقطۂ نگاہ سے اپنے نمائندہ کا انتخاب کریں گے۔ جس کی وجہ سے یہ انتخاب وحدتِ فکر اور قومی فہم و فراست کے آئینہ دار ثابت ہوں گے اور اس طرح ملک میں قومی یک جہتی کی فضا پروان چڑھ سکے گی۔"

اِس اداریہ کو دیکھنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کالعدم سیاسی پارٹیوں کے مخلص ارکان

باہمی مشاورت سے پارٹی بازی کے خلفشار اور انتشار سے بالاتر رہ کر اپنے علم، تدبر، اور تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآنِ حکیم جیسے عظیم اور روشن منشور کی روشنی میں اس کی مقرر کردہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی خاطر اپنے حالات کے مطابق جزئیات اور قانون کیوں مرتب نہیں کر سکتے؟ کیا قرآن حکیم کے منشور میں انسان کو انسان کی محکومیت سے آزاد کرانے کا طریق موجود نہیں؟ کیا اس میں انسانیت کے لیے معاشی محکومی کا علاج موجود نہیں؟ کیا اس نے عائلی زندگی کو ایک مہکتے ہوئے چمنستان میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی حدود متعین نہیں کیں؟ اور کیا اس میں یہ نہیں دیا گیا کہ خوف و حزن سے پاک معاشرہ کے لوازم کیا ہیں؟ کیا اس میں فرد اور معاشرہ کے حسین امتزاج کے لیے کوئی نشاندہی نہیں کی گئی؟ اور بقول قائدِ اعظم کہ "کیا یہ وہی کتابِ عظیم نہیں جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہے؟" جب اس کتاب کے منشور میں یہ تمام خصوصیات یقینی طور پر موجود ہیں اور اس کی تیار کردہ نرسری کے نوخیز پودے اور تکریم آدمیت کے حامل عالمِ انسانیت کے لیے ایک سایہ فگن پیڑ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں تو کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسان پارٹیوں اور فرقوں میں تقسیم ہو اور پھر ایک دوسرے کے لیے بغض و عناد کی فضا پیدا کرے جو پارٹی بازی کا خاصہ ہے۔ اگر بقول برٹرنڈ رسل کے "نوعِ انسانی کے اندر قومیت کا مدار نفرت پر ہوتا ہے" تو قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق ایک ملت کے اندر پارٹی بازی کا وجود اور احیاء بھی تو نفرت و عداوت کا ہی رہینِ منت ہے کیا تاریخ اس کی شہادت نہیں دیتی کہ "مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے الگ الگ نام رکھ لیے تھے، جس نے وحدتِ انسانی کی جڑ کاٹ دی۔ قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان صرف دو گروہوں میں بٹ سکتے ہیں۔ حق کے طرف دار اور باطل کے حامی اور حق کے طرف داروں کی جماعت میں مزید جماعتیں شرک ہے۔

ہماری حالت بھی کچھ عجیب واقع ہوئی ہے۔ پہلے تو ہم خود ہی امت واحدہ کو پارٹیوں اور فرقوں کے مختلف خانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور جب ہمیں اپنے ان اعمال کی بنا پر کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہم معتوب کیوں ہیں؟ اور زبوں حال کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی ۳۸ سالہ تاریخ ہی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کی ہزار سالہ زندگی اس ادھیڑ پن کا منہ بولتی تصویر ہے۔

اس قدر ذہنی انتشار کے باعث آج ہم اپنے ان اعمال کی بدولت کس قدر ادھیڑ بن میں مبتلا ہو چکے ہیں اس کا اندازہ قارئین از خود روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۸۵ء کے اداریہ سے ہی لگا

سکیں گے جو اداریہ نگار نے "یک جماعتی نظام اور روحِ اسلام" کے عنوان سے تحریر کیا :

"یک جماعتی نظام اور روحِ اسلام

قومی اسمبلی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کر رہی ہے جس میں مستقبل کے سیاسی ڈھانچے کے لیے سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔ اس پر جن ارکان نے اختلافی نوٹ لکھے ان کی تفصیل شائع نہیں ہوئی مگر ان میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ملک میں یک جماعتی سیاسی نظام رائج کر دیا جائے کیونکہ یہ قابلِ عمل بھی ہے اور روحِ اسلام کے مطابق بھی اس کے علم بردار جناب پیر اشرف نے بحث کے دوران کہا کہ پاکستان کے عوام کے لیے یہی نظام قابلِ قبول ہے۔ پھر اس سے مارشل لاء اٹھنے کے بعد جس بدامنی کا اندیشہ لاحق ہے اس کا بھی مداوا ہو جائے گا۔ ہمیں یہ گمان نہیں کہ پارلیمنٹ اس نظریئے کو قبول کر لے گی مگر اسلام کے نام پر ملک میں یک جماعتی سیاسی نظام کی آواز آگے چل کر بھی اٹھتی رہے گی اس لیے اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ اللہ کا دین مبین ہے جس میں کوئی ابہام نہیں مگر اسلام کے مفسر بے شمار ہیں جو اپنے طبقاتی اور سیاسی مفاد کی روشنی میں وقتاً فوقتاً اس کی من مانی تعبیریں کرتے اور فکری الجھنیں پیدا کرتے رہتے ہیں اور پوری اسلامی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ ہم بہت دور نہیں جاتے گذشتہ چار چھ ماہ میں جو کچھ ہوا اسی پر نظر ڈال لیجیے۔ مجلسِ شوریٰ کے عہد میں روحِ اسلام کا تقاضا شورائی نظام تھا۔ عہدے کی طلب حرام اور انتخابات ممنوعہ تھے۔ مگر پھر شورائی نظام کی جگہ منتخب اسمبلی نے لے لی۔ عہدے کی طلب بھی حلال ہو گئی اور روحِ اسلام کی نفی بھی نہ ہوئی۔ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوئے تھے کیونکہ جماعت سازی روحِ اسلام کے منافی تھی مگر پھر جماعت سازی کو مشرف بہ اسلام کر لیا گیا۔ پیر صاحب یہ عمل خلافِ اسلام سمجھتے ہیں مگر یک جماعتی سیاست ان کے اسلامی نقطۂ نظر سے اب مباح ہو گئی ہے۔ جماعتِ اسلامی ایک مدت تک ان کی فکری اساس رہی مگر جماعتِ اسلامی کے نزدیک مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود اسلامی فلسفے کے عین مطابق ہے اور دیگر دینی مکاتبِ خیال بھی اس نظریئے سے اختلاف نہیں کرتے۔ پھر عام مسلمان کدھر جائیں؟"

کاش ہم قرآنِ حکیم سے پوچھ لیتے کہ ہم کدھر جائیں؟ تو وہاں سے اس کا جواب یقیناً مل جاتا کہ "خدا کی

رسی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔" اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ :

ع " یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

نوائے وقت کی پکار

روزنامہ جنگ لاہور کے اِس متذکرہ اداریہ سے قبل ۲۰ ستمبر ۱۹۸۳ء کو روزنامہ نوائے وقت لاہور نے جو اداریہ شائع کیا اس میں یہی خواہش ظاہر کی گئی کہ سیاسی جماعتوں کو جلد بحال کریں اور اس کے بعد نوائے وقت لاہور نے ۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو جو اداریہ لکھا ہمارے خیال میں اسے یہاں پورے کا پورا درج کر دینا چاہیئے تاکہ وہ خدشات نکھر اور اُبھر کر سامنے آجائیں جس کی بنا پر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کے لیے اِس قدر زور دیا جاتا ہے۔

" جماعتی بنیادوں پر انتخابات اور شوریٰ

وفاقی مجلس شوریٰ کے چیئرمین خواجہ محمد صفدر نے کہا ہے کہ مجلس شوریٰ اپنے موجودہ اجلاس میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کی اپنی سفارش پر نظر ثانی نہیں کر رہی ہے صدر ضیاء الحق نے شوریٰ کے آٹھویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے شوریٰ کے ارکان سے کہا تھا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کی سفارش پر نظر ثانی کریں۔ خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ صدر کی تقریر اور رائے بلاشبہ ریکارڈ پر موجود ہے تاہم مجلس شوریٰ کا اپنا طریق کار ہے ...." اِس وضاحت سے یہ شبہ باقی رہتا ہے کہ ممکن ہے شوریٰ کے اگلے اجلاس میں یہ مسئلہ زیرِ غور آئے۔ تاہم خود صاحبِ صدر نے ارکان شوریٰ کی جو کمیٹی نظامِ حکومت کے بارے میں سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم کی تھی اس کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اگلے انتخابات ۱۹۷۳ء کے آئین کی اساس پر کرائے جائیں اور یہ انتخابات جماعتی بنیاد پر ہوں اب اس کمیٹی اور ان ہی ارکان سے یہ توقع رکھنا غلط ہوگا کہ وہ اس قدر جلد اپنی متفقہ رائے تبدیل کر دیں گے۔ صدر صاحب نے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں خطاب کے دوران اس بات کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ جن کالعدم سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ان کے مذاکرات ہوئے ہیں ان سب نے ان جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے پر زور دیا ہے۔ صدر صاحب نے یہ اعتراف بھی کیا کہ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ لیکن ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آئندہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں

پر ہونے چاہئیں۔ انتخابات کے متعلق صدر صاحب کا ذاتی رجحان کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اور وہ اپنی پسند اور ترجیح کے اس طریقے کی پہلے بھی حمایت اور وکالت کرتے رہے ہیں اور اس معاملے میں ان کا ذاتی رجحان اس قدر پختہ اور گہرا ہے کہ تمام کالعدم سیاسی جماعتوں کی طرف سے پُرزور مطالبے اور اپنی ہی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کے مجموعی اتفاق سے سفارش کے باوجود ان کی یہی خواہش اور مطالبہ ہے کہ کم از کم آئندہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔

اس ضمن میں لوکل باڈیز کے حالیہ غیر جماعتی انتخابات اگر ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں تو ان سے یہ بات منظرِ عام پر آچکی ہے کہ ووٹ کھلے بندوں فروخت ہوتے رہے اور ہر جگہ "نقدی گروپ" کی ہی جیت رہی ہے۔ اس قباحت سے بظاہر کسی طرح نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ۱۹۵۸ء سے ہم یہی تماشا دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اسے نیم دلانہ طریقے سے ختم کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مثبت اور صحت مند بنیادوں پر کوشش کر کے ملک کو صحیح راستے پر ڈالا جائے تاکہ سیاست مستحکم اساس پر استوار ہو جس کے لیے جماعتی بنیادوں پر انتخابات سے انکار نہیں کیونکہ ایک بار جماعتی بنیادوں پر انتخابات ہو جائیں تو جو بھی آئندہ چار پانچ سال کا دور ہوگا وہ ہر قسم کی پابندی سے آزادی کا دور ہوگا جس سے محض انتشار کو فروغ ہوگا۔ نہ کوئی قومی تعمیری پروگرام پیش ہوگا نہ کسی متفقہ قومی لائحہ عمل کی تیاری ممکن ہو سکے گی۔ دولت مند اور صاحبِ غرض طبقہ تجوریوں کا منہ کھول دے گا۔ سودے بازیاں ہوں گی، برادری ازم چلے گا۔ ووٹوں کی بڑھ چڑھ کر نیلامی ہوگی اور قوم کو ملک کے مفادات کو داؤ پر لگا دیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ بلدیاتی انتخابات میں جو کچھ مختصر پیمانے پر ہوا ہے صوبائی اور قومی انتخابات میں وہی کچھ وسیع پیمانے پر دیکھنے میں آئے گا۔" اس کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ

"ان حقائق کے پیشِ نظر ہم صاحبِ صدر سے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ گذارش کریں گے کہ جب ملک کی سب ہی سیاسی جماعتیں، جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا مطالبہ کر رہی ہیں تو صاحبِ صدر کو بھی عوام کی پسند اور مزاج و رجحان کا خیال کرتے ہوئے اپنی ہی رائے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے۔"

راقم کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پا رہا ہوں کہ اگر اصل حرف یہ ہے کہ "غیر جماعتی بنیاد پر دولت مند اور صاحبِ غرض طبقہ تجوریوں کا منہ کھول

گا، سودے بازیاں ہوگی برادری ازم چلے گا، ووٹوں کی بڑھ چڑھ کر نیلامی ہوگی اور قوم اور ملک کے مفادات کو داؤ پر لگا دیا جائے گا۔ اور مختصر یہ کہ بلدیاتی انتخابات میں جو کچھ مختصر پیمانے پر ہوا ہے صوبائی اور قومی انتخابات میں وہی کچھ وسیع پیمانے میں دیکھنے میں آئے گا۔" بالفاظِ دیگر قوم کو ان تمام خدشات اور خطرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہی ہوں لیکن اس کے برعکس پاکستان دستور کمشن کے سربراہ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب —— کے الفاظ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ" ماضی میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرا کر سرمایہ داروں اور وڈیروں کو منتخب ہونے سے کون روک سکا جو غیر جماعتی بنیادوں پر رُک سکیں گے۔" آپ نے مزید فرمایا کہ" ہم نے اسلامی ریاست میں جماعتوں کے وجود کے خلاف سفارش کی ہے۔ متناسب نمائندگی کا مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب جماعتوں کا وجود تسلیم کیا جائے تو ہمیں یہ اجازت بھی دینا ہوگی کہ سیکولرازم اور سوشلزم اور دوسرے ازموں کے لیے کام کرنے والوں کو بھی جماعتیں بنانے کی اجازت دیں۔ اور اگر اجازت نہیں تو پھر صرف قرآن وسنّت نافذ کرنے کے لیے اتنی ساری جماعتوں کی کیا ضرورت ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں تو تمام مسلمان ایک ہی پارٹی ہیں اگر ان میں اختلافات ہیں تو شوریٰ یا اسمبلی میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حزبِ اختلاف کا تصور ہی اسلام سے بغاوت پر مبنی ہے۔ کیونکہ کسی حزبِ اختلاف کا اسلام میں کبھی وجود نہیں رہا۔" انہوں نے کہا کہ اب تو بہت سے لوگ یہ تک کہنے لگ گئے ہیں کہ حضورؐ کے دور میں بھی پارٹیاں تھیں۔ انہوں نے پوچھا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ پارٹی تو وہ تھی جو حضورؐ کو اپنا رہنما مانتی تھی اور انؐ کی اطاعت کو جزوِ ایمان سمجھتی تھی۔ تو دوسری پارٹی کون سی تھی؟ ان کا رہنما کون تھا؟ کیا وہ (نعوذ باللہ) حضورؐ کے سوا کسی دوسرے رہنما کی اطاعت کرتی تھی۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا حضورؐ کی اطاعت کو چھوڑ کر کسی اور کی اطاعت قبول کرنے والا مسلمان رہ سکتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ حضورؐ کے دور میں منافقین کی پارٹیاں تو تھیں لیکن مسلمانوں کے اندر جماعتیں یا گروہ موجود نہیں تھے۔ ان سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ پاکستان کی ایک جماعت جمعیت علمائے پاکستان کے ترجمان نے کہا تھا کہ جماعت تو حضورؐ کے دور سے مختلف شکلوں میں موجود رہی تو مولانا انصاری نے کہا کہ ہر جماعت وہیں سے رشتہ جوڑتی ہے وہ اس پر کیا کہہ سکتے ہیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور صفحہ ۴، مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۸۳ء)

لہٰذا اِس کا علاج یہ نہیں کہ قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے پارٹی بازی کے گروہ بندانہ نظام کے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق جس معاشرہ کی تعمیر ہی بغض و عناد کے

خمیر سے ہوئی ہو اس میں اتنی کشش ہی کہاں سے ہوتی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو اپنی طرف مانوس کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم نے بھی غیر قرآنی معاشرہ کی تعمیر کی تو پھر اجتماعیت کے لیے چیخ و پکار اس کا مقدر بن گئی۔ کیا پاکستان کے بہ سالہ اخبارات کی تاریخ خود اس امر کا زندہ ثبوت نہیں؟ یہی وہ چیخ و پکار تھی جو اٹھارہویں صدی میں امریکہ کے صدر جارج واشنگٹن کی آواز میں سنی گئی۔ اس نے بآوازِ بلند کہا تھا کہ:

"سیاست دان انسانی جذبات کی رو میں بہہ کر قوم کی تباہی کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ادارتی صفحہ۔ مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء)

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدائے علیم و خبیر نے انسانی زندگی کے لیے جو بھی غیر متبدل اصول مقرر کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج ازل سے تا امروز ہر جگہ مرتب ہوئے جس کی نشاندہی قدرت نے روزِ ازل سے کر رکھی ہے لہٰذا جہاں تک اِس مشاجرت کی زندگی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو آدم کو پہلے دن ہی سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ اگر تُو نے اِس شجر کو چھُونے کی کوشش کی تو (سکون قلب) کی یہ جنت تم سے چھین لی جائے گی اور پھر ذلت و خواری جو اس عمل کا فطری نتیجہ ہے تمہارا مقدر بن جائے گی۔ نیز تمہارا شعار ان مغضوب علیہ قوموں میں ہوگا، جس کا ذکر فلسفہ تاریخ کی شکل میں قرآن حکیم نے اپنی دفتین کے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ لہٰذا اگر یہ خیال ہو کہ غیر جماعتی انتخابات کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام خطرات (جن کا خدشہ اداریہ میں ظاہر کیا گیا ہے) چاروں طرف سے قوم کو گھیر لیں گے جبکہ اس کے برعکس جماعتی انتخابات کو روا رکھنے پر یہ جنت سے نکلا ہُوا آدم دوبارہ اِس فردوس گم گشتہ میں داخل ہو جائے گا جس کو حاصل کرنے کے لیے یہ خطہ حاصل کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے اقبال کے الفاظ میں اِس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎ تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا،
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

نظام سرمایہ داری اور انتخابات

نظام سرمایہ داری کی وجہ سے طبقاتی تفریق کے علاوہ کس قسم کی جمہوریت وجود میں آتی ہے، اس کے لیے راقم کو ۱۹۸۵ء میں ملکی عام انتخابات کو بطور شہادت پیش کرنا ہوگا اور یہ شہادت اپنی طرف سے نہیں بلکہ ملک کی نہایت معتبر شخصیات کی طرف سے ہے مثلاً

فروری ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کے دوران اس وقت کے مجلس شوریٰ کے چیئرمین محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنے حلقۂ انتخاب واقع سیالکوٹ میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قومی سیاست کے حوالے سے فرمایا کہ:

"سیاست ایک آدمی کا کام نہیں بلکہ یہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا کھیل ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۸۵ء)

جناب صفدر صاحب کے بعد جہاں تک مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کا تعلق ہے تو انہوں نے ایک انٹرویو کے حوالہ سے فرمایا:

"موجودہ طریقِ کار سے صرف بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار ہی منتخب ہوں گے"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ جون ۱۹۸۵ء)

آخر کار بحالی جمہوریت کے سلسلہ میں میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب کو یہ کہنا پڑا کہ:

آج کوئی غریب شخص انتخابات میں حصہ لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۹۰ء)

لہٰذا یہ اسی نظام سرمایہ داری کا ثمر ہے کہ کوئی غریب خواہ کتنا ہی باشعور، باعلم اور بہترین صلاحیتوں کا مالک ہی کیوں نہ ہو کبھی آگے نہیں آسکتا۔

جمہوریت کس طرح بحال ہوگی

صحیح جمہوریت کی بحالی کے سلسلہ میں نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ یہی وہ خامی تھی جس کا علاج تجویز کرتے ہوئے ادارہ طلوعِ اسلام نے اکتوبر ۱۹۶۷ء میں اپنے ہاں لکھا تھا کہ:

"اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہر حلقۂ انتخاب آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کیا جائے۔ مثلاً سو روپیہ ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین۔ اور اس کے بعد شرط یہ کہ اس حلقہ میں سے امیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جایئے۔ مثلاً سو سے پانچ سو روپے ماہوار آمدنی والوں کا الگ حلقۂ انتخاب۔ اور امیدوار بھی انہی میں سے ــــ اسے اسی طرح بڑھاتے جایئے۔ آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جایئے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور آخری نتیجہ یہ

ہو گا کہ (خواہ بی۔ڈی ممبر ہوں یا پارلیمانی ارکان) پورے کا پورا ایوان قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہو گا اور ان میں اکثریت ان کی ہو گی جن کی بہ لحاظ آبادی ملک میں اکثریت ہو گی۔

اِس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لیے کم از کم تعلیم کی شرط بھی عائد ہونی چاہیئے۔ اِس کے لیے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔

یہ تو رہا عام آبادی کی نمائندگی کا سوال۔ جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے، ان کے لیے نشستیں الگ مخصوص کی جا سکتی ہیں۔ "خصوصی مفادات" سے ہماری مراد ہے (مثلاً) ڈاکٹر، وکلاء، جج صاحبان، اساتذہ، اہلِ قلم، سائنٹفک تحقیقات کے ماہر، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت وغیرہ۔ ان کے لیے یہی انتخابی حلقے ہوں۔ وہی ووٹ دینے والے اور انہی میں سے امیدوار۔"

اِس کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ:

"(اِس طریقہ سے) اقتدار فی الواقعہ جمہور کے ہاتھ میں ہو گا ورنہ موجودہ کشمکش تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر ایک اپنے اپنے اقتدار کے لیے تڑپ رہا ہے اور عوام کے نام کو حصولِ اقتدار کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی اور بحالی جمہوریت

انتخابات ۱۹۸۸ء کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور میں احمد ندیم قاسمی صاحب بحالی جمہوریت کے متعلق ایک مضمون تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

انہی دنوں ہماری گفتگو دو ووٹروں سے ہوئی۔ ایک نہایت دور دراز کے ایک گاؤں سے آیا تھا۔ ہم نے اس کے علاقے میں انتخابی مہم کی صورتحال معلوم کرنا چاہی اور پوچھا کہ تم کسے ووٹ دو گے؟ وہ بولا۔۔۔۔ لیجیئے! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! ووٹ اسی کو دوں گا جس کو ہمیشہ سے ووٹ دیتا آیا ہوں۔ اپنے زمیندار کو ووٹ دوں گا اسے ووٹ نہیں دوں گا تو کیا مجھے فاقوں مرنا ہے؟ کیا میں اپنی بیوی بیٹی کی عزت کو نیلام پر چڑھا سکتا ہوں؟ کیا میں اس عمر میں ایک زمیندار کی زمینوں سے بیدخل ہو کر کوئی نیا زمیندار ڈھونڈ سکتا ہوں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نے کچی مٹی کا جو گھروندا زمیندار کی زمینوں پر کھڑا کر رکھا ہے اسے زمیندار کے کارندوں کے ہاتھوں بلیے کا ایک ڈھیر ہوتے دیکھوں؟ میں تو صاحب ووٹ دوں گا تو اسی کو دوں گا کیونکہ مجھے اپنی اور اپنوں کی عزت اور زندگی پیاری ہے۔ آپ سمجھ گئے نا؟"

دوسرا ووٹر دیہاتی نہیں قصباتی تھا۔ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ ہم نے وہی سوال اس سے بھی پوچھا کہ کسے ووٹ دینے کا ارادہ رکھتے ہو؟ وہ بولا "لیجیئے ۔۔۔۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اپنے قبلہ پیر جی کو دوں گا اور کسے دوں گا۔ پیر جی نے جس امید وار پہ ہاتھ رکھ دیا، میں پرچی اسی امیدوار کے قدموں پر رکھ دوں گا۔ ہمارے قصبے میں قبلہ پیر جی کے اکیاسی مرید ہیں۔ ہم سب نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حکم دیجئیے ہم کسے ووٹ دیں انہوں نے جو نام ارشاد فرمائے، انہی کے نشان کو ہم ووٹ ڈالیں گے۔ آخر شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میرا پہلوٹی کا بیٹا پیر جی ہی کے تعویذوں کی برکت سے پیدا ہوا تھا۔ میرے داماد کے گردے میں قبلہ پیر جی ہی کے تعویذوں نے پتھری کو ریت بنا کر پیشاب کے رستے خارج کرا دیا۔ تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان احسانات کو بھول جاؤں اور ووٹ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو دے دوں؟ جی نہیں ۔۔۔۔ ہماری جمہوریت تو یہ کہتی ہے کہ قبلہ پیر جی کا حکم مانو اور بس۔ اس سے زیادہ نہ ہمیں کچھ معلوم ہے، نہ ہم کچھ اور معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ قبلہ پیر جی ہی تو ہمارے دین و دنیا ہیں۔"

جمہوری طریق انتخاب کے دونوں نہایت تشویشناک رخ ہیں مگر جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک سے زیادہ بار عرض کر چکے ہیں، انتخابات جس طرح بھی ہوتے ہیں ہونے دیجیئے۔ پھر جو حکومتیں بھی برسر اقتدار آئیں ان سے ایسی اصلاحات اور ایسی قانون سازی کا مطالبہ کیجیئے کہ ہمارے کسان اور مزارعین بڑے بڑے زمینداروں کے محتاج ہی نہ رہیں اور وہ محتاج نہیں رہیں گے جب بڑے بڑے زمیندار کی زمینوں کو بے زمین کسانوں اور کھیت مزدوروں میں منصفانہ طور پر بانٹ دیا جائے گا۔ اسی طرح جب ہم عقل و دانش کی تعلیم کو عام کریں گے اور موجودہ سائنٹفک دور میں توہمات کے شکار لوگوں کو خود آگاہی کی دولت سے مالا مال کر دیں گے تو ووٹروں کے ووٹ پیری مریدی کے دائرے کو توڑ کر سیلف بکسوں کا رخ کریں گے، چنانچہ جب تک ہم ملک کو صد فیصد تعلیم یافتہ نہیں بنا لیتے اور جب تک ہم دینی تعلیم کے پہلو بہ پہلو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو بھی عام نہیں کرتے ہمارے ووٹوں کی بے حرمتی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔"

جمہوریت کے سلسلہ میں علامہ مشرقی کا فرمان

"میوسے نے کہا کہ مغربی جمہوریت دنیا کا سب سے بڑا فریب ہے جس کا نتیجہ ہر ملک میں سرمایہ دار کی حکومت کا قیام ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ہر ملک اور قوم میں یہ ہیجان پیدا کر دیا جائے کہ جمہوریت کے معنے سرمایہ داری کا عروج نہیں بلکہ اس طبقہ کی حکومت ہے جو اکثریت میں ہے اور چونکہ ہر ملک اور قوم میں غریب اکثریت میں ہیں اس لئے جمہوریت کے صحیح معنی صرف

غریب کی حکومت ہے لہٰذا غریب کی حکومت ہر ملک میں قائم کرنے کے لئے لازمی ہے کہ غریب کا حلقہ امیر سے الگ ہو تاکہ سرمایہ دار غریب کے ووٹ خرید نہ سکے۔" (حدیث القرآن)

اصل حل

لہٰذا اگر اِس مملکت کو حقیقی طور پر قرآنی حکومت میں متشکل کرنا مقصود ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ قوم کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی بجائے نظام سرمایہ داری کے بُت کو پاش پاش کرنے کی ترغیب اور تدبیر پیدا کی جائے جس کی شکل و صورت نے آجِ نوعِ انسانی کو اِس قدر ہراساں کر رکھا ہے۔

ایک مزید ثبوت

گروہ بندانہ زندگی کی موجودگی میں امّتِ واحدہ کے تصوّر کا پیدا ہونا مشکل اور محال ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے اور اس کا ثبوت ہمیں ۱۹۷۷ء میں قائم ہونے والے "قومی اتحاد" (جو کہ مختلف سیاسی جماعتوں کا رہینِ منت تھا) کی کارکردگی سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اِس اتحاد کے اندرونی جوڑ توڑ کی کہانی سننے کے لیے کالعدم خاکسار تحریک (جو خود بھی اِس اتحاد میں شامل تھی) کے سربراہ خان محمد اشرف صاحب کے انٹرویو کا کچھ حصّہ ضرور دیکھ لینا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ یہ انٹرویو کچھ طویل ہے لیکن راقم اِس کی دلچسپی اور سبق آموزی کے پیشِ نظر اُسے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ چنانچہ آپ شروع سے آخر تک اِن کے مندرجہ ذیل بیان کے

ایک ایک لفظ پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا انفرادیت کی اِس کالی دیوی کے چہرے پر اجتماعیت کے نور کا کہیں بھی کوئی نشان نظر آتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:

قومی اتحاد کی اندرونی چپقلش کے سلسلہ میں خان محمد اشرف خان صاحب کا انٹرویو

"قومی اتحاد کی تشکیل سے پیشتر یو ڈی ایف (متحدہ جمہوری محاذ) میں جماعتیں مشترکہ طور پر کام کر رہی تھیں۔ اِس اتحاد کو زیادہ مؤثر بنانے اور جو جماعتیں باہر رہ گئی تھیں، انہیں شامل کرنے کے لیے کوشش کی جا رہی تھی۔ جمعیت علمائے پاکستان جو یو ڈی ایف آخری

دلوں میں چھوڑ گئی تھی، اسے واپس لانے کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی سے بھی بات چیت ہوئی آخر مشترکہ طور پر اجلاس کا پروگرام بنایا گیا مگر ایئر مارشل اصغر خان خود کسی دوسری جماعت کے پاس آنے کے لیے تیار نہ ہوئے بلکہ اپنے دفتر میں اجلاس بلانے پر اصرار کیا۔ یہ چھوٹا سا اختلاف اجلاس کے انعقاد کی راہ میں رکاوٹ بن گیا کہ کون کسی اور دفتر میں جا کر اجلاس میں شریک ہو، بالآخر طے پایا کہ غیر جانبدار کی حیثیت سے رفیق احمد باجواہ کے مکان پر اجلاس بلایا جائے۔ اجلاس کے آغاز ہی میں مولانا شاہ احمد نورانی نے مطالبہ کیا کہ انہیں اور ایئر مارشل اصغر خان کو ساٹھ فی صد نشستیں دی جائیں۔ اِس طرح پہلے ہی روز جب قومی اتحاد کی تشکیل کے لیے اجلاس منعقد ہو رہا تھا سیٹوں کی تقسیم کا جھگڑا کھڑا کر دیا گیا۔ جب جمیعت علمائے پاکستان اور تحریکِ استقلال کے لیے ساٹھ فی صد نشستوں کا مطالبہ کیا گیا تو دوسرے سربراہ حیران رہ گئے کہ یہ مطالبہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مختلف رہنماؤں نے ایئر مارشل اصغر خان اور مولانا شاہ احمد نورانی کو سمجھایا کہ یہ امر قرین انصاف نہیں کہ اتنی زیادہ سیٹوں پر ضد کریں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے اتحاد کی تشکیل کے اعلان کے منتظر رہنماؤں اور کارکنوں نے بھی نورانی میاں اور اصغر خان کو سمجھانے اور اتحاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ مولانا عبدالستار نیازی بھی آئے اور رفیق احمد باجواہ نے بھی خود آ کر سمجھانے کی کوشش کی اور دوستوں نے اپنے طور پر اتحاد کے قیام کے لیے اپنی رائے دی اور چلے گئے۔

اِس مرحلے پر جب مَیں نے محسوس کیا کہ محض سیٹوں کے مسئلے پر اختلاف کی وجہ سے شاید اتحاد قائم نہ ہو سکے اور اجلاس اسی طرح ختم ہو جائے تو مَیں نے جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے قائمقام صدر سردار سکندر حیات سے کہا کہ اجلاس لاحاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ناکامی کی صورت میں رہنما واپس اُٹھ کر جانے لگیں تو انہیں باہر جانے سے روکنے کے لیے کمرے کے ایک دروازے پر آپ اور دوسرے پر مَیں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہم انہیں باہر جانے نہیں دیں گے اور مجبور کریں گے کہ اتحاد کر کے ہی اُٹھیں۔ بہرحال دوسروں کے سمجھانے بجھانے پر اور کچھ اپنی جماعتوں کے نائبین کے مشورے پر مولانا نورانی اور ایئر مارشل اصغر خان آخر کار چھتیس فیصد کوٹے پر مان گئے۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو ایئر مارشل اصغر خان پھر بھی مطمئن نہیں تھے۔

اس پر مولانا شاہ احمد نورانی نے ایر مارشل اصغر خان سے کہا کہ بیس فی صد سیٹیں آپ لے لیں۔ اور سولہ فیصد ہم لے لیں گے۔ انہوں نے یہ سب کچھ باہمی طور پر دوسروں کے مشورے کے بغیر طے کر لیا۔ سیٹوں کی تقسیم کے فیصلے کے ساتھ ہی قومی اتحاد کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔

قومی اتحاد کی تشکیل کے اعلان سے اگلے روز رات کے وقت مسلم لیگ ہاؤس میں پہنچ رہے تھے کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے فوری طور پر ایئر مارشل اصغر خان کو اشارہ کیا کہ کرسئ صدارت پر تشریف لائیں۔ وہ ہچکچائے کہ ابھی تو کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور انتخاب بھی نہیں ہوا اس صورت میں کرسئ صدارت پر بیٹھنا مناسب بھی ہے یا نہیں، اس وقت دیگر رہنما بھی مولانا شاہ احمد نورانی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے ایئر مارشل اصغر خان سے دو تین بار اصرار کیا کہ "آیئے خان صاحب! آیئے کرسئ صدارت سنبھالیے" اور پھر اصغر خان کرسئ صدارت پر بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کی صدارت میں قومی اتحاد کی تشکیل کے مسودے پر غور ہوا اور دیگر تنظیمی امور زیرِ غور آئے۔ اس اجلاس کی صدارت کے پیشِ نظر پریس کانفرنس میں بھی اصغر خان نے یہ مسودہ لے کر پڑھنا شروع کر دیا اور کسی حد تک یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ قومی اتحاد کے صدر ایئر مارشل اصغر خان ہی ہوں گے تاہم پریس کانفرنس کے بعد یہ پروگرام دیا گیا کہ رات کو پھر اجلاس ہوگا جس میں قومی اتحاد کے انتخابات بھی ہوں گے اور عہدیدار چنے جائیں گے۔ میں ذاتی طور پر قومی اتحاد کی صدارت کے لیے مولانا مفتی محمود کو موزوں سمجھتا تھا اس کی کئی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہم اسلام کے نام پر اتحاد قائم کر رہے تھے اور اسلام کے نام پر لوگوں سے تعاون کی اپیل کر رہے تھے اس لیے اس جدوجہد میں ایسی قیادت کو قیادت کرنا چاہیئے جو خود بھی اسلامی کردار کی حامل ہو ان سے ملنا ہر ایک کے لیے آسان تھا اور ان سے مشورہ کیا جا سکتا تھا ہم لوگ ان سے کھل کر اور بخوبی بات کر سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے، بعض رہنماؤں نے سردار سکندر حیات سے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ کل کس طرح مولانا شاہ احمد نورانی نے بچگانہ حرکت کی ہے کہ کسی سے مشورہ کیے بغیر اصغر خان کو صدارت کی کرسی پیش کر دی اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کی طرف سے نام پیش ہونے سے قبل آج اپنی طرف سے صدارت کے لیے نام پیش کر دیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں مفتی محمود کو دوسروں پر

ترجیح دیتا ہوں۔ انہوں نے میری تائید کی۔ مقررہ وقت پر ہم اجلاس کے لیے کمرے میں پہنچے اور ابھی گفتگو کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے اپنی طرف سے فوری طور پر کہا کہ چونکہ اجلاس انتخاب کے سلسلے میں ہے اس لیے میں اپنی طرف سے مولانا مفتی محمود کا نام صدارت کے لیے پیش کرتا ہوں۔ میری اس بات پر کچھ لوگوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ سکندر حیات نے فوراً میری تائید کردی۔ پھر نواب زادہ نصراللہ خان اور سردار شیر باز مزاری نے بھی تائید کی اور بعد ازاں پیر پگاڑو نے مفتی محمود کو صدر بنانے سے اتفاق کیا۔ اس طرح مفتی محمود کے اپنے ووٹ سمیت ان کے حق میں چھ ووٹ آچکے تھے مگر اس کے باوجود مولانا شاہ احمد نورانی نے ایر مارشل اصغر خان کا نام صدارت کے لیے پیش کردیا تھا اور ساتھ ہی دلائل بھی دینے شروع کردیئے۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ مولانا مفتی محمود پاکستان کی مخالف جماعت کے رہنما ہیں اس لیے مخالفین کو کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ میاں طفیل محمد نے فوری طور پر مولانا شاہ احمد نورانی کی اس بات کی تائید کردی کہ یہ خدشہ درست ہے۔ اس بات پر سب نے شدید ردّعمل کا اظہار کیا۔ مفتی صاحب کچھ زیادہ ہی جلال میں آگئے۔ اس دن پہلی بار میں نے انہیں کچھ غصّے میں دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو خیال کرنا چاہیئے کہ آپ نے تو پاکستان کے لیے کوئی جدّوجہد ہی نہیں کی۔ مولانا نورانی صاحب سے مخاطب ہو کر انہوں نے مزید کہا کہ آپ نے ذاتی طور پر پاکستان کے لیے کوئی جدّوجہد نہیں کی لیکن ہم نے آزادی کے لیے اپنے انداز میں اور اپنے طور پر جدّوجہد کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی تحریک کی تائید و تعاون نہیں کیا مگر جن لوگوں کو آپ پاکستان کا مخالف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہی لوگ اکثریت میں یہاں بیٹھے ہیں اور پاکستان کو بچانے اور اس کے استحکام کے لیے کام کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں اور بجائے اس کے کہ آپ مخالفین کو یہ جواب دیں کہ انہوں نے کب پاکستان کے لیے کام کیا ہے اُلٹا آپ اپنی طرف سے اعتراض ہم پر کر رہے ہیں۔ پھر مولانا مفتی محمود نے میاں طفیل محمد سے مخاطب ہو کر کہا یہ جو اعتراض مجھ پر کیا گیا ہے، آپ پر اور آپ کی جماعت پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس وقت پیر پگاڑا صاحب کی جماعت ہی ایسی ہے جس نے پاکستان بنانے کے لیے کام کیا ہے باقی کوئی اور جماعت پاکستان بنانے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔" اس کے باوجود مولانا شاہ احمد

نورانی خاموش نہ ہوئے اور دلائل پر دلائل دیتے رہے اور کہا کہ ایئر مارشل چونکہ فوج کی طرف سے آئے ہیں اور یہ بڑے مؤثر طور پر قیادت کر سکتے ہیں۔ لوگ بھی ان کے ساتھ زیادہ ہیں۔ جرأت اور بہادری سے قیادت کریں گے ــــ میں نے مولانا نورانی کی اس ضد کی وجہ یہ سمجھی کہ مفتی محمود کی متفقہ صدارت انہیں منظور نہیں اور چاہتے ہیں کہ کم از کم ووٹنگ ہو جائے کہ بعد میں یہ کہا جا سکے کہ کچھ لوگ مفتی محمود کی صدارت کے خلاف بھی تھے لیکن اگر پہلے ہی روز انتخاب کے موقع پر یہ اختلاف منظرِ عام پر آتا تو قومی اتحاد کے مستقبل کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں تھا۔

سکندر حیات نے مجھ سے پوچھا کہ اس صورت حال کا کوئی حل آپ کے ذہن میں ہے یا نہیں؟ یہ نورانی صاحب تو نہیں بیٹھتے۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس ایک نسخہ ہے میں ایک ایسا نام پیش کرتا ہوں کہ فوراً خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے پھر استفسار کیا کہ کیا آپ نورانی صاحب کا نام سیکرٹری جنرل کے لیے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ دونوں ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ میں ایک ایسے شخص کا نام پیش کر رہا ہوں جس سے نورانی صاحب بھی خوش ہو جائیں اور نئے، پڑھے لکھے طبقہ کی بھی نمائندگی ہو جائے۔ میں نے انہیں رفیق احمد باجواہ کا نام بتایا۔ ان دنوں باجواہ صاحب کو اس قدر اہمیت حاصل نہیں تھی کہ انہیں قومی اتحاد جیسی تنظیم کا سیکرٹری جنرل بنایا جاتا لیکن مولانا نورانی کو خاموش کرانے اور قومی اتحاد کے متفقہ انتخابات کے لیے میں نے مولانا شاہ احمد نورانی سے کہا کہ آپ نے دلائل تو بہت دیئے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ مفتی صاحب کے حق میں چھ ووٹ آچکے ہیں صدارت کا فیصلہ تو ہو چکا ہے اب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ووٹوں کی تقسیم ہو پھر میں نے سیکرٹری جنرل کے لیے رفیق احمد باجواہ کا نام لیا۔ مولانا نورانی جو کہ بھرپور دلائل دے رہے تھے نہ صرف خاموش ہو گئے بلکہ انہوں نے کہا کہ اگر رفیق احمد باجواہ کو سیکرٹری جنرل بنا دیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے یہ تو بہت ہی اچھی جوڑی رہے گی، اس دوران انہوں نے اصغر خان کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اس طرح صدر اور سیکرٹری جنرل کا انتخاب اتفاق رائے سے ہوا۔

پیر پگاڑا کو پارلیمانی بورڈ کا چیئرمین بنایا گیا صرف جائنٹ سیکرٹری کا عہدہ رہ گیا تو سب نے میاں طفیل کی طرف دیکھا کہ میاں صاحب نے انتخاب کے سلسلے میں کوئی رائے نہیں دی خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے استفسار کیا گیا آپ کونسا عہدہ پسند فرمائیں گے اپنی جماعت کے لیے؟ میاں طفیل محمد بکدم ناراض ہوئے اور کہا کہ ہمارے لیے آپ نے چھوڑا

ہی کیا ہے وہ وہاں سے اُٹھ کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں پروفیسر غفور احمد اور چودھری رحمت الٰہی کے پاس چلے گئے۔ مولانا مفتی محمود نے مجھ سے کہا کہ اشرف خان فیصلے تو ہو گئے ہیں لیکن دیکھنا جماعتِ اسلامی والے بزرگ چلے نہ جائیں۔ میں نے کہا، نہیں جائیں گے، واپس آئیں گے انشاء اللہ، انہیں ہم نہیں جانے دیں گے۔ چند منٹ کے مشورے کے بعد میاں طفیل محمد واپس آئے تو ان کی ترجمانی پروفیسر غفور احمد نے کی۔ انہوں نے کہا ہم اس صورت میں آپ کے ساتھ چل نہیں سکتے۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں سے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ناراضگی عہدوں کی تقسیم کی وجہ سے تھی۔ قومی اتحاد کے دیگر رہنما پریشان تھے کہ کیا خبر واپس آتے ہیں یا نہیں لیکن میں نے مفتی محمود سے کہا کہ جماعتِ اسلامی والے بڑے سمجھدار لوگ ہیں موجودہ نازک صورت میں جب کہ قوم کی لگاہیں قومی اتحاد پر ہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

چنانچہ دوسرے دن اجلاس میں آگئے اور کہا کہ ہم آپ سے تعاون کے لیے تیار ہیں اس طرح بظاہر جماعتِ اسلامی والے ان انتخابات کے ساتھ متفق ہو گئے، مگر ان کی ناراضگی کسی حد تک بدستور قائم رہی، جس کا اظہار اشاروں کنایوں سے ہوتا بھی رہا۔ اس سلسلے میں لاہور کے ایک اخبار نویس مجیب الرحمٰن شامی اور طالب علم رہنما جاوید ہاشمی مجھ سے دفتر آکر ملے اور کہا کہ آپ سے گلہ شکوہ ہے کہ آپ نے قومی اتحاد کے عہدوں کے لیے نام تجویز کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں کیا کہ جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لیے پروفیسر غفور احمد موزوں شخصیت تھے، وہ پہلے بھی جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے ہیں اور اب بھی جنرل سیکرٹری کے طور پر انہیں آنا چاہیئے تھا۔ اب بھی کوشش کریں کہ کسی طرح انہیں موزوں عہدہ مل جائے۔ یہ تھی مختصر روداد قومی اتحاد کے قیام اور اس کے انتخابات کی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ چونکہ انتخابات کا فوری اعلان ہو چکا تھا اور قومی اتحاد کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کہ وہ سیٹوں کی تقسیم اور امیدواروں کے اعلان میں مزید تاخیر سے کام لے۔ اس لیے سیٹوں کے باہمی تعین اور امیدواروں کے انتخاب کے لیے اجلاس شروع ہو گئے لیکن اس امر کا اندازہ نہیں تھا کہ سیٹوں کی تقسیم کے سلسلے میں منعقد ہونے والے اجلاسوں میں اختلاف اس حد تک بڑھیں گے کہ آپس میں ناراضگی کا اظہار ہوگا۔ ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیاں کی گئیں۔ کہا یہ گیا تھا کہ ایر مارشل اصغر خان اور نورانی میاں کی جماعتوں

کے سوا مختلف نشستوں پر کسی جماعتی تخصیص کے بغیر امیدواروں کا انتخاب ہو گا لیکن ہر جماعت اصرار کرتی رہی کہ اس کا امیدوار زیادہ موزوں، فعّال اور باصلاحیت ہے۔ اِس پر آپس میں بڑے اختلافات ہوئے اور قومی اتحاد کو چھوڑنے تک کی دھمکیاں دی گئیں۔ بالآخر بڑی مشکل سے سیٹوں کی تقسیم کا مرحلہ طے ہُوا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ، جمعہ ایڈیشن مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۵ء)

کسی نے کیا خوب کہا تھا۔ چراغ کون یہاں آئے گا جلانے کو کہ غسلِ خوں سے فراغت نہیں زمانے کو۔ بہرحال یہ تھا قومی اتحاد کے متعلق جناب خان محمد اشرف صاحب کا وہ انٹرویو جس کے متعلق پاکستان مسلم لیگ (چٹھہ گروپ) کے سربراہ خواجہ خیرالدین نے کہا تھا کہ:

"نظامِ مصطفےٰ کی تحریک میں عوام نے قربانیاں دیں مگر (اِس تحریک کی) قیادت مخلص نہ تھی۔" (بحوالہ لوائے وقت مورخہ ۹ [illegible] ۱۹۸۶ء)

۱۹۸۸ء کے انتخاب کے بعد کی حالت

پارٹی بازی کے بل بوتے پر غسل خون کی اگر مزید روئداد معلوم کرنی مقصود ہو تو ۱۹۸۸ء کے عام ملکی انتخابات کے تحت معرض وجود میں آنے والی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی باہمی چپقلش کو ایک سبق آموز مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے ثبوت میں سال بھر کے ملکی اخبارات کی ایک ایک سطر خود اپنی گواہ آپ ہے۔ جس کو دیکھنے کے بعد ہر قلبِ حساس یہ سوچنے پر مجبور دکھائی دے گا کہ آزادی کا وہ پودا جو قائد اعظم کی شب و روز کوششوں سے ملتِ اسلامیہ کی سرزمین پر پاکستان کے نام پر لگایا گیا تھا۔ نامعلوم یہ ہماری عناد پرستی باہمی کدورت بدکرداری اور مفاد پرستی سے (حاکم بدہن) کب جڑوں سے اکھڑ جائے اور جس کے نتیجے میں ملتِ پاکستان کے ایک ایک فرد کے گلے میں غلامی کا وہ طوق کس لحہ دوبارہ پہنا دیا جائے جس کو اتارنے کے لئے شاہ ولی اللہ سے لے کر قائد اعظم تک کے محسنانِ ملت کا خونِ جگر شامل ہے۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد صرف ایک سال کے عرصہ میں ہماری پارٹی بازی کی سیاست گری نے کیا کیا گل کھلائے اسکی ترجمانی صدر مملکت جناب غلام اسحاق خاں نے دسمبر ۱۹۸۹ء کے سینٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کچھ اس طرح کی۔

صدر مملکت کا بیان

"پورا سال معمولی سے معمولی بات پر بھی محاذ آرائی ہوتی رہی اسمبلیوں نے ہر کام کیا سوائے قانون سازی کے مخالف فریق کے شروع کئے گئے ہر کام میں کیڑے نکالے گئے۔

پنجاب اسمبلی میں گالی گلوچ

اس ایک سال میں نفرت اور عداوت کی آگ کو بھڑکانے کا یہ سلسلہ اس قدر جاری رہا کہ پنجاب اسمبلی کے دسمبر کے اجلاس میں اپوزیشن اور سرکاری بنچوں میں فحش گالیوں کا تبادلہ ہوا اور نوبت مار کٹائی تک جا پہنچی۔ حتیٰ کہ باہمی نفرت کو شعلہ فشاں بنانے کے لئے مرکز اور پنجاب کے مابین ایک دوسرے کے خلاف اخبارات کے صفحہ اوّل پر بڑے بڑے اشتہارات کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس افراط و تفریط کے باعث ۱۹۸۹ء کے مالی سال کے ابتدائی پانچ ماہ میں مدیر روزنامہ جنگ کی تحریر کے مطابق مملکت پاکستان کو ۲۱ ارب روپے کا تجارتی خسارہ ہوا۔

وزیر مذہبی امور کا بیان

لیکن اس کے باوجود وفاقی مذہبی امور مولانا مظہر ندوی کا روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۱۷ جون ۱۹۸۸ء کے حوالے سے فرمان یہ ہے۔

"سیاسی جماعتوں کے آئینی تحفظ کو برقرار رکھا جائے گا"

سیاسی جماعتوں کے اس آئینی تحفظ سے کسی قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں اور پارٹی بازی کی بنا پر متحارب گروپ آپس میں کس طرح دست و گریباں ہوتے ہیں۔ اس کی تصور کشی کی بجائے ہمیں یہاں صرف اور صرف مسلم لیگ کے دو دھڑوں میں صدارت کے انتخاب پر ظہور پذیر ہونے والے منظر کو ہی دیکھ لینا چاہیئے۔

مسلم لیگی قیادت کے انتخاب کا منظر

اسلام آباد (نمائندہ جنگ) مسلم لیگ کی قیادت کا بحران ختم کرنے اور پارٹی کے نئے صدر کا انتخاب کرنے کے لئے پیر پگارا اور سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی سربراہی میں قائم مسلم لیگی گروپوں کی جنرل کونسلوں کا مشترکہ اجلاس ہفتے کو زبردست ہنگامہ آرائی کی نذر ہوتے کی وجہ سے غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ تین گھنٹے سے زیادہ دیر تک ہونے والے اس ہنگامے میں متحارب گروپوں کے کارکن اور کونسلر ایک دوسرے کے ساتھ گریباں دے ماریں ہنگامے کے دوران متحارب گروپ سٹیج پر قابض ہو گئے اور صدارت کے امیدواروں محمد خان جونیجو اور فدا محمد خاں کے حق میں انہوں نے زبردست نعرے بازی کی اس ہنگامے کی وجہ سے اسلام آباد ہوٹل جہاں یہ اجلاس منعقد کیا گیا تھا کی قیمتی کراکری ٹوٹ پھوٹ گئی ہنگامہ آرائی کی یہ فضا دیکھ کر کئی بزرگ مسلم لیگی رہنما ایک

دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے اس ہنگامہ آرائی میں کئی کونسلروں اور کارکنوں کے کپڑے پھٹ گئے اور کئی افراد کو چوٹیں آئیں۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۴ ؍اگست ۱۹۸۸ء)

ہمارے نزدیک اس موقع پر کیونکہ پاکستان کی تفصیلی سیاسی تاریخ لکھنا ممکن نہیں اس لئے صرف ایک دو ماہ کے ملکی اخبارات کی چند ایک چیدہ چیدہ سرخیوں پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ جاننے کے لئے کوئی دشواری باقی نہ رہے کہ پارٹی بازی کی اس لعنت نے مملکت پاکستان کو تباہی کے کس کنارے تک پہنچا دیا۔

ماہ دسمبر اور جنوری ۹۰-۱۹۸۹ء کے اخبارات کی چند ایک سرخیاں

"قائداعظم رح کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لاہور کارپوریشن کے کونسلروں میں ہاتھا پائی اور گالی گلوچ۔" اپوزیشن لیڈر کونسلر ملک اسلم پرویز نے اپنی تقریر میں نواز شریف کا ذکر کیا تو ڈپٹی میئر خواجہ ریاض محمود نے اسے دھکے دے کر سٹیج سے نیچے اتار دیا۔"

- "قومی اسمبلی میں وزیراعظم کی موجودگی میں ہنگامہ۔"
- وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں کشیدگی کا مسئلہ اللہ تعالیٰ ہی حل کر سکتا ہے۔ (نواز شریف)
- گیارہ ماہ سے جاری مرکز پنجاب لڑائی کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں (وزیراعلیٰ نواز شریف)
- وفاقی حکومت کے داڑھی دار وزراء اپنا منہ بند رکھیں۔ (دریشک صوبائی وزیر قانون)
- ہمارا مقصد ملک کو پیپلز پارٹی سے نجات دلانا ہے۔ (نوابزادہ نصراللہ خاں)
- پنجاب حکومت نے قومی بجٹ کی تیاری میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔
- ہمارے مخالفوں سے کہیں کہ اب وہ کان پکڑ کر توبہ توبہ کریں۔ (بے نظیر)
- صدر مملکت کی طرف سے دعائے خیر بھی

مرکز اور صوبوں کو سمجھا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قوم کو سیدھی راہ پر لائے۔ (صدر اسحاق)

- جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے مینار پاکستان کے سبزہ زار میں جماعت کے سہ روزہ اجتماع (جس میں تقریباً ۷۵ ہزار کارکنوں نے شرکت کی) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ ان لوگوں کو (پیپلز پارٹی کو) اقتدار سے ہٹا دیں۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۹؍نومبر ۱۹۸۹ء)

CamScanner

و ضیاء دور میں لطف اٹھانے والوں کا تعاون نہیں چاہیئے۔ (محترمہ بے نظیر)

و بے نظیر اسمبلی میں ۱۱۹ حامی شو کرادیں ہم تحریک واپس لے لیں گے۔ (نواز شریف)

و ہماری صفوں میں کوئی بے غیرت نہیں مخالفوں کا منہ کالا ہوگا۔ (محترمہ بے نظیر)

و بے نظیر جیت گئیں اپوزیشن کو ۱۰۷ ووٹ ملے۔

و انشاء اللہ بہت جلد حکومت کو نکال باہر کریں گے۔ (میاں نواز شریف)

و نواز شریف اور ولی خاں مل کر ملک توڑنا چاہتے ہیں۔ (بیگم نصرت بھٹو)

و روٹی۔ کپڑا اور مکان دینے والی صرف خدا کی ذات ہے،
خدائی دعوے کرنے والے مشرک ہیں۔

ہم ۱۸ فروری سے پہلے ہی ملک دشمن عناصر کو ملک سے باہر نکال دیں گے۔
(میاں شہباز شریف ایک انتخابی جلسہ سے خطاب)

و مل کر چلیں ورنہ آنے والی نسلیں جوتے ماریں گی۔ (علی اکبر ایم پی اے جنگ فوم ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء

و حمیدہ کھوڑو اسلامی اتحاد کو جلسے کرانے کے لئے لاکھوں روپے دے رہی ہے (وفاقی وزیر ریلوے)

و پی پی ۲۰ مارچ کے نام پر انکھیں کیوں چراتی ہے ایک بار دنگل کرے اور جان چھڑائے۔
(متحدہ اپوزیشن کے سربراہ جناب غلام مصطفےٰ جتوئی)

و پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی دونوں جماعتیں گندگی پھیلا رہی ہیں۔
(انتخابی جلسوں سے مولانا نورانی کا خطاب)

و ایم کیو ایم کی اپیل پر ہڑتال کے دوران کراچی میں خون کی ہولی اہم افراد ہلاک

و ہڑتال کی کال دینا ایم کیو ایم کا جمہوری حق ہے (متحدہ حزب اختلاف کے راہنما جناب نوابزادہ نصر اللہ خاں)

و مل کر چلیں ورنہ آنے والی نسلیں جوتے ماریں گی۔ (علی اکبر ایم پی اے جنگ فوم ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء)

اپوزیشن نے اسمبلی کے اندر حکومت سے تعاون ختم کر دیا حکومت کو جلد احساس ہو جائے گا کہ اس نے اپنے لئے کیا نئی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ حکومت نے پارلیمنٹ کا اجلاس اچانک ملتوی کر کے قومی اتحاد اور اتفاق کے لئے جاری کوششوں کو سبوتاژ کر دیا ہے (متحدہ اپوزیشن)

ایم کیو ایم کے پاس ۵۰ ہزار کلاشنکوفیں ہیں (راجہ صفدر حسین - ایم پی اے)

و مہاجر قومیت کا نعرہ مارشل لاء میں آیا۔ (عبدالقادر - ایم پی اے)
و الطاف حسین ہانگ کانگ کنکشن کے آدمی ہیں (حنیف رامے جنگ فورم میں)
و ایم کیو ایم پر الزام کے جواب میں اپوزیشن کا اسمبلی سے واک آؤٹ۔ (نواز شریف)
و ضیا دور میں قومی پرچم جلانے پر الطاف حسین اور آفاق شاہد کو سزا مل چکی ہے (مخدوم خلیق رکن قومی اسمبلی)
و قائداعظم کے شہر میں خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ (میاں نواز شریف)

ایک انتخابی حلقہ کے حالات زندگی

پارٹی بازی کی سیاست انتخابی مہم کے دوران کس قسم کی اصول پرستی کا مظاہرہ کرتی ہے اس کے لئے فروری ۱۹۹۰ء میں انتخابی حلقہ ۹۹ لاہور کے حالات زندگی کی چند ایک جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں

و حلقہ ۹۹ (راوند وغیرہ) میں کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔
و دونوں برسر اقتدار جماعتوں پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی نے اپنے اپنے امیدوار کی کامیابی کے لئے تمام وسائل انتخابی مہم میں جھونک دیئے۔
و وزراء کی نئی چمکتی اور جھنڈے والی گاڑیاں دیہات کی گندی اور تنگ گلیوں میں رات گئے رواں دواں رہی ہیں۔
و انتخابی دفاتر ہوٹلوں میں بدل گئے۔
و لاؤڈ سپیکروں والی ایک ہزار گاڑیاں اعلانات کرتی پھر رہی ہیں۔
و "چوہا سسٹم" (چوری چوری ووٹ خریدنا) کے تحت ووٹ مانگے جا رہے ہیں۔
و قوم کا یہ پیغام ہے کہ حکمرانوں ڈٹ جاؤ ورنہ مٹ جاؤ (میاں نواز شریف)
و الیکشن کے سلسلے میں مرکزی وزراء کی طرح) اسلامی اتحاد بھی صوبائی وزراء کی ڈیوٹیاں لگا دی گئیں۔
و حلقہ ۹۹ لاہور میں اخراجات کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔
و بارہ لاکھ گز کپڑا (تقریباً ایک کروڑ روپے مالیت کا) بینروں اور جھنڈیوں پر صرف ہوا۔ (حقانی)
و فی الواقعہ اس حلقے نے پانی پت کے میدان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ (ارشاد احمد حقانی)
و (الیکشن کے متعلق) جنگ کے دفتر میں ملک اور بیرون ملک سے ۴۵ ہزار کالیں وصول ہوئیں۔
و (انتخابی نتائج کے بعد ۲۴ فروری ۱۹۹۰ء کا بیان) پی پی پی ملک دشمن ہے اس کا اب مقابلہ نہ کیا گیا تو بعد میں بہت مشکل ہو جائے گا۔ (میاں نواز شریف)
و آئی جے آئی کی طرف سے جاری ہونے والے تقرر ناموں، چیک اور پلاٹوں کی الاٹمنٹ کے احکامات پر ۱۸ فروری ۱۹۹۰ء کے بعد کی تاریخ درج ہے۔
و وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف نے کہا ہے کہ انتخابات میں دھونس اور اسلحہ کی نمائش کو ختم نہ کیا گیا تو ایسا انقلاب

آئے گا جسے روکا نہیں جا سکے گا (بحوالہ اداریہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ ۹ ۔)

و ہم اس تمام کی تمام روئداد پر کوئی تبصرہ پیش نہیں کرنا چاہتے صرف یہی کہیں گے۔

تم اپنے حس کی سرمستیوں میں ڈوبے ہو
تمہیں خبر ہے کوئی حالتِ تباہ میں ہے

بہر حال سچ تو یہ ہے کہ اک عمر چاہیئے داستاں کے لئے بقول ایک شاعر کے۔

زیست کے مختصر سے وقفے میں اتنی بھرپور وارداتیں ہیں
تم کو فرصت اگر ہو سننے کی کہنے والی ہزار باتیں ہیں

نوجوان نسل کا مستقبل سیاست کی بھٹی میں

سیاست کے اس میدان کارزار میں ملتِ پاکستان کے سکون قلب کو جس بے دردی سے نظر انداز کرتے ہوئے مرغ بسمل کی طرح تڑپتے پھڑکنے پر مجبور کر دیا۔ مندرجہ بالا اخبارات میں اس کا اندازہ دیئے گئے باہمی بیانات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس جگر خراش داستان کو فراموش کرنے سے پیشتر روزنامہ جنگ لاہور (مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ء) کی طرف سے شائع ہونے والا اداریہ خانہ جنگی کے حزن کی وضاحت کرنے کے لئے بلا تبصرہ پیش خدمت ہے جناب مدیر کے الفاظ میں :

آئی جے آئی کے سربراہ اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے سیدو شریف میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے سرحد کے عوام سے اپیل کی کہ وہ پی پی کو ووٹوں سے مسترد کر دیں اگر عوام نے ایسا نہ کیا تو ایم ایس ایف (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن) کے ذریعے پی پی کا محاسبہ کریں گے اور یہ فورس اس وقت تک محاسبہ کرتی رہے گی جب تک ان کے دماغ درست نہیں ہو جاتے ۔" اس کے بعد جناب مدیر لکھتے ہیں کہ :

پی پی اور آئی جے آئی ملک کی دو بڑی سیاسی حریف قوتیں ہیں ان کے درمیان کم و بیش ایک سال سے جاری محاذ آرائی بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں اور اس میں ہر روز جو شدت پیدا ہو رہی ہے وہ بھی کوئی راز نہیں رہا۔ لیکن وزیر اعلیٰ پنجاب نے ایک طلبہ تنظیم کو حریف سیاسی قوت اور حکمران جماعت کا دماغ درست کرنے کے لئے استعمال کرنے کے جس عزم کا اظہار کیا وہ ملک میں امن و امان کے لئے قطعی طور پر کوئی خوش آئند بات نہیں، ہر قابل ذکر سیاسی جماعت نے تعلیمی اداروں میں اپنے حامی طلبہ پر مشتمل تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں اگر ہر سیاسی جماعت اپنی مخالف سیاسی جماعت کا دماغ اسی طرح درست کرنے کا رویہ اپنا لے تو ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ ایک طرف تو طلبہ کو سیاست سے الگ رکھنے پر زور دیا جاتا ہے اور تعلیمی اداروں میں سیاسی مداخلت کو روکنے کی کوششیں کی جاتی ہیں دوسری طرف طلبا کو بھرپور انداز میں سیاست میں گھسیٹنے بلکہ انہیں وفاق میں حکمران اور دو صوبوں

میں برسر اقتدار جماعت سے دست و گریبان کرنے کا عندیہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ پی پی کی پالیسیوں اور اس کے طرز عمل پر تنقید بجا اور درست صوبوں سے اس کی محاذ آرائی کی پالیسی سے ہزار اختلاف کے باوجود آئی جے آئی کے سربراہ کی سوچ کسی طرح بھی ملک و قوم کے مفاد میں قرار نہیں دی جا سکتی۔ سیاستدانوں کی لڑائی سیاستدانوں تک محدود رہنی چاہیئے طلبہ کو اس میں الجھانا قطعی نامناسب اور غیر دانشمندانہ فعل ہے۔"

قارئین گرامی یہ ہے ہمارے سیاہ نامہ اعمال کی وہ سیاہ تاریخ جس کو ہم نوجوانوں کے خون سے رقم کرنے کے لئے پینتالیس سال سے برابر مصروف کار ہیں جب کہ علامہ اقبال کی روح شاہی مسجد لاہور کے بلند و بالا میناروں کے سائے میں ہر صاحب اقتدار کے کانوں میں اس کا ہاتھ تھامے یہ آذان دینے میں مصروف ہے کہ :۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ہم اقتدار کی رسہ کشی اور ذاتی انا کے تحفظ اور اس کی نمود کے جوش میں یہ بھول ہی گئے کہ ہم نے نوع انسان کی حد تک آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدلنے کے لئے اس خطہ پاک میں وہ نظام حیات قائم کرنا تھا جس کا ہر کلمہ گو باسی علامہ اقبال کے اس شعر کی زندہ تصویر بن جائے کہ :۔

ہو حلقہ یاراں تو ابریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں نہ ہوا تو اس کا جواب جاننے کے لئے ہمیں پاکستان کی ایک معتبر اور باشعور ادبی شخصیت جناب عبدالقادر حسن کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ موصوف اپنے مشہور اخباری کالم "غیر سیاسی باتیں" لکھتے ہیں کہ

"ایسا کیوں ہے اس لئے کہ ہمارے رہنماؤں اور حکمرانوں نے بحالی جمہوریت کے عرصہ میں جو دیا ہے وہ اب کاٹ رہے ہیں۔ سفارشوں خوشامدوں اور رشوتوں کے ذریعے قائم رہنے اور چلنے والی حکومتوں میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ نواز شریف ہوں۔ قائم علی شاہ ہوں، نواب بگٹی ہوں، شیر پاؤ ہوں یا بے نظیر، ہمارے یہ حکمران اور سیاست دان ہماری اخلاقی تباہی کے ذمہ دار ہیں انہوں نے اسمبلی کے ممبروں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ملک کے قانون اور ضابطوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ پہلے پولیس تھانے بیچا کرتی تھی اب وزرائے اعلیٰ نے پولیس سمیت تھانے بیچنے شروع کر دیئے ہیں۔ اسمبلیوں کے اراکین کی سفارش اور خواہش پر تھانے دار لگائے جاتے ہیں اور علاقہ کی پولیس کسی ایم پی اے یا ایم این اے کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اسمبلی کے اندر اس رکن کی حمایت کے معاوضے میں تھانہ اور تھانے دار تو کیا ایس پی اور ڈی سی تک بیچ دیئے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایس پی کوئی ڈی سی کوئی اے سی اور کوئی تھانے دار ایسا ہو جو اپنی اہلیت اور استحقاق کی بنا پر کہیں تعینات ہو۔ میرٹ نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی بس سفارش سب سے بڑا میرٹ ہے یا پھر رشوت اگر کسی کے پاس سفارش ہے یا رشوت کے لئے روپیہ ہے تو اس

کے پاس سب سے زیادہ میرٹ ہے۔ کسی امتحان میں حاصل کئے گئے اچھے نمبر اور کسی عرصہ ملازمت میں اعلیٰ کارکردگی یہ سب ماضی کی باتیں ہو چکی ہیں اور ہمارے جمہوری منتخب حکمرانوں کی "لعنت" سے خارج ہیں"۔

اب فوج کشی کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی

اس تصویر کشی کے بعد جناب عبدالقادر حسن صاحب دلی کے پریس کلب میں بھارت کے مشہور دانشور مسٹر منین (جس نے مشرقی پاکستان کی فتح کا منصوبہ تیار کیا تھا) کا ایک بیان تحریر کرتے ہیں کہ (یہ ہندو دانشور) "ایک پاکستانی سے گفتگو کے دوران کہنے لگا کہ اب ہمیں آپ پر فوج کشی کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ آپ باقی ماندہ پاکستان ہمیں پلیٹ میں رکھ کر پیش کریں گے۔

صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ایک میٹنگ کا حال

ہندو دانشور کے اس بیان کو تحریر کرنے کے بعد جناب عبدالقادر حسن لکھتے ہیں کہ

"اس بھارتی کی ہرزہ سرائی کے جواب میں ایک صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ایک میٹنگ کا حال سنئے۔ اراکین اسمبلی کے ساتھ اس میٹنگ میں حاکم اعلیٰ نے کہا کہ اب سفارشوں کا سلسلہ ختم ہونا چاہیئے اور تمام ملازمتیں، ترقیاں اور تقرریاں میرٹ کی بنیاد پر ہونی چاہئیں۔ تمام اراکین اسمبلی نے اس کی پرزور تائید کی لیکن ایک بزرگ سامنے والی کرسی کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمیں اپنے حلقہ کے لوگوں کے کام کرنے ہوتے ہیں اس لئے زیادہ نہیں تو پچیس فیصد تک ہمارا کوٹہ مقرر کر دیجئے باقی سب میرٹ پر رکھ لیں۔ حاکم اعلیٰ کی کیا مجال کہ انکار کرتا۔ اس نے مان لیا جب پچیس فیصد تک سفارش کا کوٹہ مان لیا گیا تو شہ پاکر ایک اور رکن اٹھے اور انہوں نے ذرا زیادہ موثر انداز میں اپنی مجبوریاں پیش کیں اور سفارش کا یہ کوٹہ پچاس فیصد تک پہنچ گیا ایک ہوشیار رکن اسمبلی نے جب حاکم اعلیٰ کی طرف سے مراعات کا یہ پھیلتا ہوا سلسلہ دیکھا تو انہوں نے صاف صاف بات کہہ دی اور بولے کہ جناب والا یہ میرٹ اور استحقاق وغیرہ کی کتابی باتیں چھوڑیئے، آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم اسمبلی میں کسی میرٹ پر آئے ہیں یا ہم اس کے حقدار ہیں کہ ہم اسمبلیوں میں قوم کی نمائندگی کریں ہم جو بھی ہیں وہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں اس لئے جانے دیجیے ان باتوں کو اور جو ہم کہیں بس وہی کیجیے اور اس کے بعد باری باری درخواستیں جیبوں سے برآمد ہونا شروع ہو گئیں اور ان پر دستخط کرتے کرتے اور ضروری احکامات لکھتے لکھتے جب حاکم اعلیٰ کے ہاتھ تھک کر قریب قریب سن ہونے والے ہو گئے تو ان کی جان کی خلاصی ہوئی مگر صرف اس دن تک جب ان کے ساتھ دوسری ملاقات ہو گی فرداً فرداً اجتماعی طور پر"۔

قارئین گرامی یہ کہانی صرف آج کی نہیں بلکہ یہ تماشہ شب و روز پینتالیس سال سے جاری و ساری ہے اور یہ ہمارے اسی "حسنِ عمل" کا نتیجہ ہے ؎

بہاریں آ گئیں لیکن کسی بھی پھول کے رخ پہ
نہ کوئی رنگ ہی آیا نہ کوئی تازگی آئی

کیا یہ حقیقت نہیں کہ:

رہزن کو ڈھونڈتے ہیں مسافر اِدھر اُدھر
رہبر سے کارواں کی قیادت نہ ہو سکی (فیض کوثر)

قوم زندہ اور تابندہ رہنا چاہتی ہے

بہرحال اس بھری محفل میں شیرینی کی اس فراخ دلانہ تقسیم کا حال بیان کرنے کے بعد موصوف قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ ڈھارس دیتے ہوتے دردمندانہ انداز میں لکھتے ہیں کہ

"اس وقت قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ کشمیری بھائیوں کے زخم اپنے اوپر محسوس کر رہی ہے۔ حریت پسندوں کے کلمہ تکبیر کے نعرے اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کی آزادی کے لئے وہ اپنا کردار ادا کرنے میں بے تاب ہے کیونکہ اس قوم کی عظیم اکثریت میں ان حکمرانوں کے تسلط کے باوجود اتنی جان باقی ہے کہ ایک مسلمان بھائی کے درد کو محسوس کر سکے مگر ہمارے حکمران پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس قوم سے ایمان کی روشنی نکال دیں اور اسے ایک بے جان تابعدار اور بزدل قوم بنا کر اس پر حکومت کرتے رہیں لیکن قوم زندہ اور تابندہ رہنا چاہتی ہے اس کے آمنے سامنے دو محاذ کھلے ہوئے ہیں ایک ملک کے اندر حکمرانوں کے خلاف اور دوسرا ملک سے باہر اس کے دشمنوں کے خلاف اور اس جنگ میں انشاء اللہ فتح اس قوم کی ہو گی اور ملک کے اندر اس کے دشمنوں کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ستر برس تک وسط ایشیا کے مسلمانوں کو روسی درندے زیر نہیں کر سکے تو ہمارے کمزور حکمرانوں میں اتنی ہمت کہاں کہ اس قوم کو بے حس بنا سکیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۷ فروری ۱۹۹۰ء)

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

لیکن اس نم کو پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم نئی نسل میں امت واحدہ کے تصور کی آبیاری کریں ورنہ آج تو حالت یہ ہے کہ:

بیرونی جارحیت کا خطرہ اور ہمارے سیاست دان

مقبوضہ کشمیر کی سنگین صورت حال کے پیش نظر بھارت نے افغانستان کے تعاون سے پاکستان کے خلاف ایک نیا محاذ کھولنے

کی سازش شروع کر دی ہے چنانچہ وی پی سنگھ کے ایک پیغام کے جواب میں افغان وزیر خارجہ عبدالوکیل آج نئی دہلی روانہ ہو رہے ہیں۔ بھارت اپنے اندرونی مسائل اور خاص طور پر کشمیر کی صورت حال سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے پاکستان کے خلاف کوئی بھی سازش کر سکتا ہے ان حالات میں ہمیں جس اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے اس کا مکمل فقدان ہے، صدر غلام اسحاق کے مشورے کے باوجود ملک کی دو بڑی سیاسی طاقتوں کے درمیان محاذ آرائی جاری ہے اور ارکان پارلیمنٹ کو بریفنگ کے دوران بھارت کی طرف سے جنگ شروع کرنے کے خدشے کے اظہار کے باوجود حکومت اور اپوزیشن پارٹیاں دست و گریبان نظر آتی ہیں سرحد میں مسلم لیگ کو توڑنے کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں کے اندر ایک نیا انتشار پیدا ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور سرحد میں ایک نئی کشمکش شروع ہوتی نظر آ رہی ہے، کراچی کے واقعات پر بھی فریقین ایک دوسرے کو مطعون کرنے میں مصروف ہیں۔ کراچی میں ہنوز امن نہیں ہوا کہ پیر صاحب پگاڑا نے حیدر آباد میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھنے کا خدشہ ظاہر کر دیا ہے اپوزیشن پی پی پی پر سندھ کے فسادات کا الزام لگا رہی ہے جب کہ پی پی کی طرف سے سندھ میں فسادات کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپوزیشن اور خاص کر ایم کیو ایم پر ڈالی جا رہی ہے کہ وہ ملک میں مارشل لاء لگوانا چاہتی ہیں۔ یہ صورت حال ایک عام پاکستانی کے لئے سخت تشویش کا باعث ہے، کیا ہمارے سیاسی رہنماؤں نے بیرونی جارحیت کے خطرات سے آنکھیں بند کر لی ہیں؟ کیا انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے المیہ کو فراموش کر دیا ہے؟ اگر آج بھی سیاسی قوتوں نے قومی مفادات کے پیش نظر رواداری اور افہام و تفہیم کی راہ اختیار نہ کی تو کوئی معجزہ بھی ہمیں کسی نئے المیے سے محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔"

(اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء)

ہمارا خیال ہے کہ ان پیش کردہ حقائق سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی ہو گی کہ:۔

کیوں دن کی تجلی پنہاں ہے کیوں روشن روشن رات نہیں
پھولوں کے سہانے بربط پر کیوں نغموں کی برسات نہیں

قصہ پاکستان عوامی تحریک کے نام کا

امت واحدہ کے تصور کے فقدان اور سیاسی فرقہ بندی کے انتشار نے مسلمانوں کا جو حشر کر رکھا ہے اس کے لئے سابقہ صفحات کی ایک ایک سطر اپنی گواہ آپ ہے لیکن حیرت ہے کہ چاروں طرف سے اس قدر ذلت آمیز عذاب میں گرفتار ہونے کے باوجود ہم نے اپنی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہ کیا بلکہ اس کے برعکس نت نئی پارٹیوں کو جنم دینے کے لئے ہم ہر لحہ کوشاں رہے حتیٰ کہ اپنے محدود تصورات کی تکمیل کی خاطر اس ذات اقدس اعظم کا نام کچھ اس طرح استعمال کیا کہ جیسا کہ معاذ اللہ انسانیت کے اس امام اعظم نبی آخر زماں ﷺ نے ہمیں یہ اجازت دے دی ہے کہ ہم امت واحدہ کے بلند و بالا تصور کی کشتی کو اخوت کے سمندر سے نکال کر سیاسی فرقہ بندی کے جوہڑ میں لا کھڑا کریں۔

قارئین سے میری التماس ہے کہ وہ میرے ان الفاظ کو کسی کی ذات پر حملہ تصور نہ کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے مندرجہ ذیل اقتباس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیں جو ماہنامہ ادارہ منہاج القرآن مئی جون جولائی ۱۹۸۹ء سے لیا گیا ہے اور جس میں جناب پروفیسر طاہر القادری کی سیاسی جماعت (پاکستان عوامی تحریک) کے نام کرنے اور اس کا نام تجویز کرنے کی روئداد بیان کی گئی ہے اس روئداد کے پیش نظر اگر کوئی غیر مسلم ہم سے یہ سوال پوچھ لے کہ

ڈیڑھ ہزار سال کے بعد پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۸۹ء میں سیاسی فرقہ بندی کی اجازت دربار نبوی سے کس طرح حاصل ہوئی تو نہ جانے اس کا ہم کیا جواب دیں گے۔ اب آپ ماہنامہ منہاج القرآن کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں لکھا ہے کہ

اس سلسلہ میں ادارے کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی رو سے ملکی حالات کے پیش نظر مختلف سروے کروائے گئے جن کی رو سے ۹۰-۵ فیصد عوام نے سیاسی جماعت بنانے کے حق میں رائے دی اس کے بعد بعض دوستوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اذن حاصل کرنے کے لئے استخارے بھی کئے جس کے نتیجے میں انہیں بھرپور رہنمائی اور کامیابی کی خوشخبری تک نصیب ہوئی۔ جب یہ بات طے ہوئی تو بانی تحریک نے کہا کہ سیاسی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے آقا و مولا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر آپ سے نظر کرم کی بھیک مانگیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مقدس کے سائے میں سابقہ مرحلوں کی طرح اس مرحلے کی کامیابی کی بھی ضمانت میسر آجائے یہ بات ان کی زبان سے نکلنے کی دیر تھی تمام مرکزی قائدین نے اس پر لبیک کہا اور یہ طے ہو گیا کہ ہم اپنے سیاسی پروگرام کا اعلان بارگاہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری بیت اللہ جل شانہ کے بعد کریں گے۔" لہٰذا طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ قافلہ قائد تحریک کی سربراہی میں ۳۰ مارچ ۸۹ء کو لاہور سے روانہ ہوا۔ تقریباً پچاس افراد پر مشتمل اس قافلے میں ادارے کی نمایاں شخصیات شامل تھیں۔

گنبد خضرا کے سائے میں سیاسی جماعت کا نام

مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران ہی یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ انقلابی مرحلے کے آغاز کے سلسلے میں جس سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کیا جانا ہے اس کا نام بھی گنبد خضرا کے سائے میں ہی طے ہونا چاہیئے۔ تمام دوستوں کو اطلاع کر دی گئی کہ رات نماز تراویح کے بعد مسجد نبوی کے صحن میں (جہاں سے گنبد خضرا نظر آتا ہے) جماعت کے نام کے سلسلے میں میٹنگ ہوگی۔ تمام ساتھی نماز کے بعد اکٹھے ہو گئے احقر نے قائد کے حکم کے مطابق نشست کی غرض و غایت اور اہمیت بیان کی اس کے بعد محترم محمد خلیل الرحمٰن قادری نے نام کے سلسلے میں چند اصولی باتیں بیان کیں مختلف نام پیش ہوئے لیکن ان میں سے دو نام منتخب ہوئے کہ ان میں سے کوئی ایک رکھ لیا جائے جناب محمد انور قریشی نے دونوں نام قائد محترم کی خدمت میں پیش کئے اس کے بعد ریاض الجنت میں نوافل ادا کئے گئے۔ مبارک قدموں میں حاضری دی گئی نوافل ادا کئے گئے اس کے بعد اصحاب صفہ کے چبوترے پر بیٹھ کر مختصر گفتگو ہوئی۔ قائد محترم بار بار کہہ رہے تھے کہ گنبد خضرا کے سایہ میں نام طے کر کے جانا ہے کیونکہ جو کمی ہماری کوتاہیوں کی بنا پر رہ جائے گی سبز گنبد کے سایہ کی برکت سے پوری ہو جائے گی۔ اس سلسلہ کی اگلی نشست حضور علیہ السلام کی عیدگاہ مسجد غمامہ کے سامنے فرش پر شروع ہوئی۔ سامنے گنبد خضرا کے جلوے تھے اور آپ کی عیدگاہ تھی حضور علیہ السلام کی توجہات کی برکت سے مختصراً تبادلہ خیال کے نتیجے میں تمام ساتھی ایک نام پر متفق ہو گئے۔

صبح یہ نام آقا کی بارگاہ میں پیش کریں گے

نام طے ہونے کے بعد قائد محترم نے فرمایا کہ یہ نام ہم صبح آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں پیش کر کے کرم کی بھیک مانگیں گے جب

پروفیسر صاحب صبح ہوٹل سے مسجد نبوی حاضری کے لیے روانہ ہونے لگے تو آپ نے فرمایا پہلے میری فون پر پاکستان میں حضور پیر صاحب سے بات کراؤ کیونکہ پہلے ان کی بارگاہ میں نام پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اسے آپ کے واسطے سے حضور علیہ السلام کی بارگاہ اقدس میں پیش کریں گے آپ نے فون پر حضور پیر صاحب کی خدمت عالیہ میں نام پیش کیا اور سفارش کے لئے بھی عرض کیا۔ آپ نے فی الفور منظور فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انشاء اللہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پسند فرمائیں گے۔

جماعت کا نام پیش کیا گیا

قائد محترم نے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں نام پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے بھی آپ ہی کا لطف وکرم ہے ہم کچھ بھی نہیں اب بھی آپ ہی کی رحمت کے بھروسے پر قدم اٹھا رہے ہیں ہمیں اپنے نعلین پاک کا سایہ عطا فرمادیں مزید کرم یہ فرمائیں کہ قیام مدینہ کے دوران ہی کوئی ایسی علامت کا اظہار فرمائیں جس سے ہمیں اس بات پر اطمینان قلب نصیب ہو کہ آئندہ پروگرام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین کا سایہ نصیب ہو گیا ہے اور آپ نے اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرمالیا ہے۔ اسی روز آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام کی آرزو کی تکمیل بھی فرمادی جو بعد میں آپ نے مسجد نبوی میں تمام اہل قافلہ کو خوشخبری کی صورت میں سنائی۔ ۱۱ر اپریل ۸۹ء تین بجے صبح بذریعہ پی آئی اے کراچی پہنچے تو ادارہ کے احباب نے پرجوش استقبال کیا۔ پروفیسر صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سیدھے خواجہ ہاؤس پہنچے جہاں سحری کا کھانا کھایا اور بعد نماز فجر آرام کیا۔

رفیق ادارہ محترمہ مسز مہاجر کا خواب

اسی روز منہاج القرآن ویمن لیگ کی بعض سرکردہ بہنیں پروفیسر صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائیں جن میں مسز مہاجر بھی شامل تھیں۔ انہوں نے ایک نہایت روح پرور اور ایمان افروز خواب سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم ایک قافلے کی صورت میں سرکار دوعالم کے درِ اقدس پر حاضر ہیں اور اصحاب صفہ کے چبوترے پر بیٹھے ہیں مسجد نبوی کو سجایا جارہا ہے۔ مسجد نبوی کے خدام سیڑھیاں لئے چلے آرہے ہیں اور بعد ازاں ایک خادم سیڑھی پر چڑھ کر جلتا ہوا بلب اتارتا ہے اور اس کی جگہ نیا بلب لگا دیتا ہے ہمارے پوچھنے پر وہ بتلاتا ہے کہ پروفیسر صاحب آئے ہوئے ہیں اس لئے مسجد کو سجایا جارہا ہے۔ میں دل ہی میں خوش ہو رہی ہوں اور اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ معمر خاتون مسز مہاجر نے جب یہ خواب اپنے بہن بھائیوں کی موجودگی میں قائد تحریک کو سنایا تو فرطِ مسرت سے ہر ایک کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بعد ازاں حاضرین میں مٹھائی تقسیم کی گئی جو خواب کی خوشی میں وہ اپنے ہمراہ لائی تھیں۔" یہاں یہ امر قابل ذکر ہے اسی رسالہ کے مطابق پروفیسر ہادی صاحب کا نام بھی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی رکھا تھا۔

امریکی قونصل جنرل کا خراج تحسین

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی اس عوامی تحریک کے منظم ہونے کا تعلق ہے تو امریکی قونصلیٹ جنرل مسٹر رچرڈ میکی اور کی پولیٹکل افسر نے تحریک کے مرکزی دفتر کا معائنہ کرتے ہوئے کہا کہ (ہم نے) "پاکستان عوامی تحریک جیسی منظم پارٹی امریکہ میں بھی نہیں دیکھی۔"

(بحوالہ روزنامہ آفتاب مورخہ ۱۹۹۰-۴-۱۷)

آپ اس تمام روئداد کی تہہ میں پوشیدہ جذبہ محرکہ پر غور کرنے کے علاوہ جناب پروفیسر مجیب کے یہ الفاظ بھی سامنے لائیے کہ "گمنام رہنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔" چنانچہ اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب محمد سعید صاحب (سول اینڈ ملٹری گزٹ کے سابق ڈپٹی ایڈیٹر) اپنی کتاب "آہنگِ بازگشت" میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"اس جملے پر زندگی میں، جیسے جیسے غور کیا ہے بڑی بڑی غریب پروریوں، طبل وحشم کی قہرسامانیوں، اور جبّہ و دستار کی فیض باریوں کے بھرم کھلتے گئے ہیں۔ ابدی شہرت پانے کے لیے انسان نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ تاریخ عالم اس ضمن میں بڑی لرزہ خیز داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مضحکہ خیز یا عبرت انگیز داستان مشرقی یورپ کے ایک نواب سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ مرض الموت میں جب اس پر نزع کا عالم طاری ہوا تو آخری دعاؤں کے لیے لاٹ پادری صاحب کو بلایا گیا۔ پادری صاحب نے آتے ہی بڑے ادب سے پوچھا: "حضور کوئی ایسی تمنا جو اس حسرت کدۂ عالم میں ناتمام رہ گئی ہو؟" نواب صاحب نے سرد آہ بھری اور کہا: "مقدس باپ، خداوند خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔ کوئی نعمت ایسی نہیں تھی جس کی خواہش کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ ایک حسرت ایسی ہے جو گوشۂ لحد میں بھی چین نہیں لینے دے گی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ چند برس گزرے، پاپائے روم اور شہنشاہِ جرمنی بیک وقت میرے ہاں مقیم تھے اور میں انہیں قلعے کی سیر کراتے ہوئے اس برج کی جانب بھی لے گیا جو سب سے زیادہ خطرناک ہے ان دونوں نے منڈیر پر سے جھک کر نیچے گہری گھاٹی میں جھانکا۔ میں بپاسِ ادب ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ مجھے یہ حسرت آج تک کھائے جا رہی ہے کہ میں نے انہیں پیچھے سے دھکا کیوں نہ دے دیا۔ اور یوں اپنے لیے بقائے دوام کے دربار میں نشست محفوظ کیوں نہ کرالی۔"

نہ معلوم انسان کی خودنمائی کی یہ حسرت کتنی نسلوں کا خون کر دیتی ہے۔ کاش انسان کو اس خونِ ناحق کا احساس ہو جائے۔

پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر سیاسی لیڈروں کے بیانات میں ایک جواز یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس مملکت کا وجود بذاتِ خود ایک سیاسی پارٹی کا رہینِ منت ہے اور اگر خدانخواستہ مسلم لیگ کا وجود نہ ہوتا تو پاکستان کا خواب بھی کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا لہٰذا سیاسی پارٹیوں

کا ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ مفید تر ہے[1]۔ راقم کا خیال ہے کہ اس دلیل کا جواب اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے جو طلوعِ اسلام نے قائدِ اعظم کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے مجلّہ مئی ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا:

"مسلمانوں کی اکثریت کے علاقہ میں ان کی آزاد مملکت قائم کی جائے۔ ان کے مقابلہ میں ہندو اور انگریز نے خود مسلمانوں کی کچھ ایسی پارٹیاں کھڑی کر دیں، جو کہتی تھیں، کہ قائدِ اعظمؒ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ آزاد مملکت کا مطالبہ مسلمانانِ ہند کا مطالبہ ہے۔ قائدِ اعظمؒ ان کے نمائندہ نہیں ہیں۔ اس کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ یہ ثابت کیا جائے، کہ مسلمانوں کی اکثریت کا یہی مطالبہ ہے، اور قائدِ اعظمؒ ان کے واحد نمائندہ ہیں۔ یہ ثبوت مسلم لیگ بہم پہنچاتی تھی۔" طلوعِ اسلام نے متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی وجۂ جواز بیان کرنے کے بعد کہا کہ حصولِ پاکستان کے بعد وہ وجۂ جواز ختم ہو گئی ہے۔ لہٰذا ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ مسلم لیگ کو بطور پارٹی ختم کر دیا جائے۔ قیامِ پاکستان تک تو اس کی ضرورت تھی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔ کسی پارٹی کی بھی ضرورت نہیں۔" اور جب "قائدِ اعظم نے اپریل ۱۹۴۸ء میں پشاور کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ملک کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں صرف ایک پارٹی رہے اور وہ مسلم لیگ ہو، اس لیے:-

آپ متحد ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ رہیئے کیونکہ اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔"

تو قائدِ اعظمؒ کی عقیدت و احترام کے باوجود طلوعِ اسلام نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں ہی تحریر کیا تھا کہ:-

"ہمارے اربابِ حل و عقد کا ارشاد ہے کہ مختلف پارٹیوں کا وجود مملکتِ پاکستان کے لیے سخت خطرناک ہوگا — بالکل بجا اور درست — لیکن وہ اس کا علاج کیا بتاتے ہیں یہ کہ ان کی اپنی پارٹی (مسلم لیگ) موجود رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی بننے نہ پائے۔ اور اگر بن جائے تو باقی نہ رکھی جائے۔ معترضین کا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کونسی آسمانی سند ہے کہ اس کا وجود ضرور رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی نہ رہے۔ آپ غور کیجئے کہ

---

[1] اور یہی دلیل روزنامہ نوائے وقت نے اپنے اداریہ مورخہ یکم نومبر ۱۹۸۴ء میں دہرائی تھی۔

دنیا میں پارٹی بازی اور گروہ بندی کی بنیاد ہی اس غلط اصول پر ہے کہ ایک پارٹی یہ چاہتی ہے کہ میرا وجود ضرور رہے لیکن کوئی دوسری پارٹی میرے مدِ مقابل نہ آئے۔ اس کی دلیل یہ دیتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور کوئی دوسری پارٹی حق پر نہیں لیکن آپ سوچیے تو بعینہٖ یہی دلیل اس پارٹی کے مدِ مقابل دوسری پارٹی دے رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح بیسیوں پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضد سے قائم رہتی ہیں۔ غور کیجئے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا یہ طریق نہیں کہ آپ اپنی پارٹی کو برسرِ حق قرار دے کر اس کے وجود کو قائم رکھیں اور باقی پارٹیوں کو باطل ٹھہرا کر ان کا استحصال کرنے لگیں۔ اس طرح سے پارٹیوں کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کے ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ وہی طریق ہے، جسے قرآن نے تجویز کیا ہے — کہ کسی پارٹی کا وجود ہی نہ رہے۔ جب پارٹیاں ختم ہو جائیں گی تو ملت باقی رہ جائے گی، جس طرح جب فرقے ختم ہو جائیں گے تو باقی مسلمان رہ جائیں گے۔ آگے بڑھیے تو جب قومیں ختم ہو جائیں گی تو باقی انسانیت رہ جائے گی، یہی قرآن کا مقصود ہے۔" (طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۴۸ء)

۱۹۶۵ء کے آخر میں مؤقر ماہنامہ "نصرت" (لاہور) کے مدیر اور پنجاب کے سابق وزیرِ اعلیٰ جناب حنیف رامے صاحب نے جناب پرویز صاحب کے ایک طویل انٹرویو کے دوران سیاسی پارٹیوں اور بنیادی جمہوریت کے متعلق ایک اہم سوال کیا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے جناب حنیف صاحب کا یہ اٹھایا گیا سوال اور پرویز صاحب کا جواب درج ذیل کیا جا رہا ہے۔

"حنیف صاحب! پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رُو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لیے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی

جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروّجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز صاحب جب میں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں دیکھا کہ اُمت میں سیاسی پارٹیوں یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اِس لیے کہ میرے نزدیک قرن اوّل کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی معیّن کردہ منزل کی طرف اُٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اُوپر تک اُٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدّت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی۔ اِس لیے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیہ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اُس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصّے کو مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو اِس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جس حصّے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔ بالکل نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلّت و خواری نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ "پارٹی ساز جمہوریت" کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں، حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں، یعنی وہ نظام جس کے لیے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا — تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً نافذ کرنا ہوگا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمّت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہیئے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی —— منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز — تو عذابِ الیم ہے۔ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ نتائج بڑے

ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے لیکن منافقت کو، جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمّت ہو، اس نے بدترین زندگی قرار دیا ہے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ جہنّم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

مَیں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معیّن کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔" (بحوالہ ماہنامہ نصرت اور طلوع اسلام جنوری ۱۹۶۶ء)

ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو"

سچ ہے کہ طلوع آفتاب کے باوجود اگر کوئی انسان اپنی آنکھیں خود ہی بند کر لے تو اسے کچھ بھی تو نظر نہیں آتا اور یہاں تو کسی ایک آدھ کی بات نہیں اگر جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ہم سب کے سب انفرادیت کے اسی مرض میں مبتلا دکھائی دیں گے اور یہ حالت صرف پاکستان کی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کی ہے۔ آج بنگلہ دیش جو کل کا مشرقی پاکستان تھا، وہاں بھی سیاسی پارٹیوں کی تعداد ۷۶ کے قریب ہے۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۵ رجولائی ۱۹۸۳ء)

پروفیسر محمد منوّر صاحب کا مضمون

اس انتخابی داستان کے بعد جناب پروفیسر محمد منوّر صاحب (گورنمنٹ کالج لاہور) جنہوں نے علامہ اقبال پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، کے "مضمون" دل صاحبِ اخلاص ہے انصاف طلب ہے کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موضوع کے نیچے یہ لکھا تھا کہ "کوئی بلند شخصیت فرقوں کی تنگنائی میں نہیں سما سکتی"۔ لیکن اس مضمون کے آخر پر یہ بھی تحریر تھا کہ "خدا پاکستان کو استحکام اور اسلامی سنّی رنگ میں استحکام عطا کرے۔" کاش صاحبِ مضمون اہلِ پاکستان کے لیے شیعہ سنّی فرقوں کی ان تنگناؤں سے بلند ہو کر قرآنی رنگ میں امّت واحدہ کے رنگ کے استحکام کی خاطر دعا گو ہوتے۔

CamScanner

نظامِ مصطفےٰ اور کفر کے فتوے

فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی یہ تباہ کن روش انسان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر کس قدر تنگ نظر اور خود پسندی میں مبتلا کر دیتی ہے، اِس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً" ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفےٰ کے نام پر متحدہ محاذ کی طرف[1] سے چلائی گئی تحریک سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اِس اتحاد میں جماعتِ اسلامی، پاکستان مسلم لیگ، پاکستان جمہوری پارٹی، تحریک استقلال، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلمائے پاکستان، جمعیت العلمائے اسلام، آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس اور خاکسار تحریک شامل تھیں۔ مولانا مفتی محمود اس تنظیم کے صدر، اور رفیق احمد باجواہ اس کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ لیکن اگر اس تحریک کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو ان ۹ ستاروں میں سوائے نظامِ مصطفےٰ کی اصطلاح کے کوئی چیز مشترک نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ یہ حضرات ذہنی طور پر باہم اس قدر متشدد واقع ہوئے تھے کہ مفتی محمود صاحب مرحوم نے مودودی صاحب مرحوم کے ایک بیان پر حیدر آباد پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مودودی صاحب کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں جو مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اِس پریس کانفرنس میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے اِس سے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اِس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے وہ امریکہ کا اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پر پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔ (بحوالہ روزنامہ زندگی لاہور مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۶ء

فرقہ بندی اور افطاری

اِس کے علاوہ ایک اور قابلِ افسوس مثال یہ ہے کہ" ۲۵ اگست ۱۹۷۷ء کی شام متحدہ محاذ (قومی اتحاد) کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے تو اسلامی اخوت اور نظامِ اسلام کے قیام کے دعویدار

---

[1] ۔ جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔

کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی محمود صاحب اور نواب زادہ نصر اللہ خان دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی جبکہ مولانا نورانی صاحب اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی صاحب نے جماعت کرائی اور تحریکِ استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے ساتھ نماز پڑھی۔

(بحوالہ روزنامہ مساوات ۲۶ راگست ۱۹۷۷ء)

اور یہ سب کچھ چوہدری ظہور الٰہی صاحب مرحوم کی قیام گاہ واقع میں گلبرگ لاہور پر رونما ہوا۔

صدرِ مملکت کو غلط فہمی ہوئی ہے

اس کے بعد ایک اور مثال جو مولانا نورانی صاحب کے حوالے سے ہفت روزہ ایشیا کی ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں مل سکے گی۔ اور جو اوپر دی گئی مثالوں سے بھی زیادہ قابلِ افسوس اور تعجب انگیز ہے اور وہ یہ کہ :

" ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں (شاہ احمد نورانی ؎۱) اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب یہ ابھی تین چار روز پہلے ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لیے گئے "تا کہ دار العلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد ان سے رکھوایا جائے تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں انہوں نے یہ فرمایا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے (مارشل لاء کے لگنے کے فوراً بعد) قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے آپ کو غلط اطلاعات دی گئی ہیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعت قلبی ہے لیکن گستاخِ رسول کے لیے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضور پُر نور کی شان میں تنقیص کرنے والے کے

؎۱ نورانی صاحب ورلڈ اسلامک مشن کے چیئرمین ہیں۔

لیے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مولانا احمد رضا خاں کا لکھا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتوے موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے ہم الحمدللہ اس فتوے پر عمل کرتے ہیں۔ کوئی بھی شخص خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں[1] کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ[2] کا ہو کسی شاتم رسول ؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ۔ اور میں نے کہا جناب والا یہ چار ٹکے کے لوگ ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ غلط اطلاع ملی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ ہمارے میں ایسی رواداری، فراخدلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتم رسول کے لیے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی اور اس کے لیے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں ہی اذان ہوتی تھی۔ علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں بے شمار لوگ ہیں" ایک طرف تو یہ مولانا نورانی اِس قومی اتحاد میں شامل ہیں اور دوسری طرف مفتی محمود کے متعلق ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قومی اتحاد کے سربراہ (مولانا مفتی محمود نے ابھی تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا اور وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ مملکت مستحکم ہو۔ مفتی صاحب نے تحریک نظام مصطفےٰ ؐ کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

سو اس فرقہ بندی کے خود ساختہ مسلک کے متعلق زیادہ سے زیادہ اور کیا کہا جائے گا کہ ؎

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

لہٰذا ان تصریحات کی روشنی میں انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے حضرات جو ایک دوسرے کے نزدیک شاتم رسول اور گستاخ رسول ہوں تو ان کے ہاتھوں کس قسم کا نظام مصطفےٰ نافذ ہوگا اور اس کی شکل و صورت کیا ہوگی۔ جب کہ خدائے علیم نے نظام خداوندی نافذ کرنے والوں کی پہچان یہ بتائی تھی کہ :- ؎ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کس قدر خوبصورت ہے یہ قول کہ "فساد کا اوّلین جرثومہ نفرت سے پیدا ہوتا ہے"، جبکہ پارٹی بازی اور فرقہ بندی کی بنیاد ہی نفرت پر ہوتی ہے۔

---

[1] اس سے مراد مفتی محمود صاحب ہیں۔ [2] اِس سے مراد مودودی صاحب ہیں۔

امام کسے بناؤں

قائدِ اعظم کی دُور رس نگاہ اِس قسم کی فرقہ واریت کی نمازوں کے خطرناک نتائج سے کس قدر واقف تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۱۹۳۸ء میں ایک تبلیغی وفد نے جس میں مقتدر حضرات شامل تھے، قائدِ اعظم سے ملاقات کی۔ ان حضرات نے دورانِ گفتگو قائدِ اعظم سے کہا کہ آپ مسلم لیگ کے جلسوں کے لیے اس قدر وسیع و عریض پنڈال کھڑے کرتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع کرتے ہیں اس سے آپ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ قائدِ اعظم نے فرمایا:

"علاوہ دیگر امور کے اِس سے غیر مسلموں کے دل پر ملّت اسلامیہ کے اتحاد اور ہیئتِ اجتماعیہ کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔"

اِس پر علماء حضرات نے قائدِ اعظم سے کہا کہ اس کے لیے ہم آپ کو اس سے زیادہ مؤثر طریق بتاتے ہیں کہ آپ نماز کے وقت اِس پنڈال میں باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

"نماز کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں لیکن آپ کی تجویز میں مجھے ایک خطرہ نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ نماز باجماعت میں ایک امام کا ہونا ضروری ہے۔ اگر میں خود امامت کے لیے کھڑا ہو جاؤں تو شاید یہ تمام حاضرین میرے پیچھے نماز پڑھ لیں۔ لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا اِس کے بعد سوال یہ پیدا ہو گا کہ امام کسے بنایا جائے۔ اگر امام دیوبندی ہو گا تو بریلوی حضرات اِس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے اور یہی صورت بریلوی کی بجائے دوسرے امام کے پیچھے پڑھنے میں پیدا ہو گی۔ لہٰذا اس صورت حال میں یہ ہو گا کہ ایک پنڈال میں مختلف جماعتیں کھڑی ہو جائیں گی۔ اِس سے غیر مسلموں کے سامنے امّتِ مسلمہ کے اختلاف نمایاں ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ جو قوم ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتی وہ ایک متفقہ علیہ اسلامی ریاست کیسے قائم کرے گی اس وقت تو آپ مجھے معاف فرمائیں۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔" (بحوالہ "تعمیر پاکستان اور علماء")

جنگ فورم میں اجتماعی نماز سے انکار

قائدِ اعظم نے تو اِس قدر انتشار و خلفشار کے باوجود پاکستان قائم کر دیا لیکن قرآن حکیم کی موجودگی

کے باوجود ہمارے قلب و نظر میں یک رنگی اور یک نگہی آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء میں پوری دنیا کے سامنے نگاہوں کو جھکا دینے والا منظر اس وقت پیش آیا جب روزنامہ جنگ لاہور کے پلیٹ فارم پر جنگ فورم کے تحت "اتحاد ملت کیسے قائم ہو سکتا ہے" کے موضوع پر اظہار خیال کرنے کے لیے مختلف علماء کرام تشریف لائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۸۵ء کو مذکورہ اخبار کے سرورق پر جو خبر شائع ہوئی وہ یہ تھی کہ:

"جنگ فورم میں اتحاد امت مسلمہ کے موضوع پر طویل اور فکر انگیز تقریروں کے بعد مختلف مکاتب فکر کے علماء نے اکٹھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔"

روزنامہ جنگ کے مطابق جنگ فورم میں مختلف مکاتب فکر کے علماء جن میں علامہ محمود احمد رضوی علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا گلزار احمد مظاہری، مولانا موسیٰ بیگ (جامعہ المنتظر) مفتی محمد صدیق ہزاروی اور مولانا اختر کاشمیری، شامل تھے۔ اتحاد امت کے موضوع پر اس فورم کے دوران نماز عشاء کے وقت انہیں اکٹھے نماز کے لیے کہا گیا تو علامہ احسان الٰہی ظہیر اور علامہ محمود احمد رضوی نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ مولانا موسیٰ بیگ نے کہا کہ وہ باقی علماء کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ مغربین پڑھ چکے ہیں۔ مولانا صدیق ہزاروی بھی ان علماء کے ساتھ فورم ہال سے چلے گئے اور کہا کہ وہ اپنے گھر جا کر نماز ادا کریں گے۔ جبکہ مولانا گلزار احمد مظاہری اور مولانا اختر کاشمیری ایک دوسرے کی امامت میں نماز ادا کرنے پر رضامند ہو گئے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے اپنے گھر جا کر نماز ادا کی۔ اس موقع پر مختلف علماء نے کچھ آراء اور تجاویز بھی پیش کیں۔ چنانچہ علامہ محمود احمد رضوی نے فرمایا کہ "فقہ اور مسلک کا اختلاف ختم کرنا ممکن نہیں۔" علامہ احسان الٰہی ظہیر نے فرمایا "مستند علماء کا بورڈ قائم کیا جائے۔" مولانا موسیٰ بیگ نے کہا کہ "ضروریات پر اتفاق رائے ہو سکتا ہے۔" گلزار مظاہری نے ارشاد فرمایا کہ "بورڈ کی تجویز قابل عمل نہیں، اختلافات صدیوں پرانے ہیں۔" لیکن اس کے باوجود مولانا اختر کاشمیری نے کہا میرے نزدیک اتحاد امت کا سوال ہی غلط ہے یہ سوال نہیں الزام ہے۔ امت میں ہمیشہ اتحاد تھا، اتحاد ہے اور رہے گا۔ اگر یہ سوال کسی درجے میں موجود ہے تو مسلم ریاستوں کے سربراہوں سے کیا جانا چاہیئے۔ اس اختلاف کے ذمہ دار علماء نہیں۔"

اس موقع پر علامہ احسان الٰہی ظہیر نے مولانا مظاہری سے بعض سوالات کیے۔ جن کی تفصیل یہ ہے علامہ احسان الٰہی ظہیر: آپ چاہتے ہیں یہ سارے اختلافات ہوتے ہوئے بھی اتحاد ہونا چاہیئے۔ کیا یہ اتحاد دائمی ہو گا؟

مولانا گلزار مظاہری: مقاصد متعین ہوں گے جدّ و جہد مشترک ہوگی تو کامیابیاں ہوں گی۔ ابھی آپ اسلام کے آنے تک عارضی اتحاد کرلیں۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر: "کون سے اسلام کی آپ بات کر رہے ہیں؟"

مولانا مظاہری: کتاب و سنّت والا اسلام۔"

علامہ احسان الٰہی: "تمام طبقوں کی تعبیر مختلف ہے۔ قانون دانوں اور صحافیوں کے لیے ضابطے ہو سکتے ہیں۔ ان کا معیار مقرر ہو سکتا ہے تو علماء کے لیے کیوں نہیں۔ کیا یہ معیار نہیں ہو سکتا کہ کون عالم ہے اور کون نہیں؟ ۱۹۵۳ء میں ۳۱ علماء نے اکٹھے ہو کر جو ۲۲ نکات تشکیل دیئے تھے، اس طرح کی بات اب بھی ہو سکتی ہے۔"

علامہ محمود احمد رضوی نے کہا "وحدتِ ملّت کا جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے مسلمان متفق ہیں اور متفق ہو جائیں جہاں تک وحدتِ امّت کے لفظ کی خوبصورتی اور حسن کا تعلق ہے اِس کا تو اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ فکری طور پر ہر مسلمان دلی طور پر صمیم قلب کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ وحدتِ امّت کی کوئی شکل یا کوئی صورت پیدا ہو جائے کیونکہ یہ بالکل واضح اور ظاہر بات ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے کرنے کے لیے جب تک ملّتِ اسلامیہ متفق اور متحد ہو کر قدم نہیں اُٹھاتی اس وقت تک وہ اپنی منزل کو نہیں پا سکتی"

مولانا گلزار احمد مظاہری نے کہا کہ "علامہ احسان الٰہی ظہیر اور علامہ محمود احمد رضوی نے اچھی باتیں کی ہیں۔ پہلی بات "جنگ" سے عرض کروں گا کہ اگر آپ نے اِس مسئلے کو چھیڑا ہے تو اسے کم از کم ایک سال تو چلایئے اِس پر ایک مذاکرے کی بجائے اِس کے بارے میں تمام شعبوں کے نمائندہ لوگوں سے کچھ لکھوایئے انہوں نے کہا کہ ہمارے اختلافات اتنے شدید نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھ ہی نہ سکیں۔ اقوامِ متحدہ میں بھی تو ہم اتنے اختلافات کے باوجود اکٹھے بیٹھے ہی ہیں بلکہ جہاں بھی ضرورت پڑتی ہے کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا اور علماء اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں جتنی بار علماء جمع ہو جاتے ہیں اتنی بار اور کوئی طبقہ جمع نہیں ہوا۔ سب سے بڑی مثال ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء کی ہے۔ ایک طرف مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تھے اور دوسری طرف مولانا ابو الحسنات تھے اور ایک سٹیج پر مہینوں نہیں سالوں اکٹھے رہے۔ ملّت کے مسائل پر سب سے زیادہ فکرمند طبقہ علماء کا ہے۔ اگر کل کی غلامیوں سے آزاد کرانے کے لیے محمد مصطفٰےؐ آئے تھے تو آج روس و امریکہ کی غلامیوں سے آزاد کرانے کے لیے ہمیں اُٹھنا چاہیئے۔"

جنگ فورم کی اُس افسوسناک روئیداد کے پیشِ نظر دوسرے روز مختلف حضرات نے جو ردِّ عمل ظاہر کیا

اِس کے تحت کالعدم مسلم لیگ پنجاب کے سیکرٹری جنرل افتخار علی شیخ نے فرمایا "علماء کے ایک ساتھ نماز نہ پڑھنے پر دُکھ ہُوا ہے وہ دوسروں کو کیا راہ دکھائیں گے" اور بزرگ سیاستدان ممتاز دولتانہ نے فرمایا کہ "(اگر) ایسا ہو تو میں ضرور ان کے پیچھے نماز کے لیے جاؤں گا۔" خاکسار تحریک کے رہنما خان اشرف صاحب نے فرمایا کہ "علماء کا ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا نہ کرنا ہی ملتِ اسلامیہ کے اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔" اور کالعدم مساوات پارٹی کے سربراہ جناب محمد حنیف رامے نے کہا کہ "یہ سوال تو کسی فرقے والے سے پوچھیں۔ میں تو غیر فرقہ واریت کا قائل ہوں اور اس معاشرے کی بنیاد رکھنے کا حامی ہوں جو سیکولر ہو۔"

جبکہ کالعدم جمعیت علماء اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) پنجاب کے صدر سیّد امیر حسین گیلانی نے کہا ہے "روزنامہ جنگ نے یہ خبر شائع کر کے انتہائی زیادتی کی ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ایک ساتھ نماز پڑھنے پر رضامند نہیں ہوئے[ا]۔ اگر کسی نے کسی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا تو یہ اس کا ذاتی فعل تھا۔ اگر ملک میں دینی طرز کی حکومت قائم ہو عوام کی اکثریت کی فقہ متعین کر کے ڈپٹی کمشنر اور گورنر نماز کی امامت کریں تو تمام مسالک کو ایک ساتھ نماز پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

سیّد امیر حسین گیلانی صاحب سے کون عرض کرے کہ علامہ اقبال کے الفاظ میں : (اب تو)

ے زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

لہٰذا نئی نسل اب اِس قسم کے دبیز پردوں کو اُلٹ کر خود دیکھ لے گی کہ امن و سکون کے راستے میں کون لوگ حائل ہیں اور یک جہتی کے فقدان کی وجہ جواز کیا ہے ؟

آئندہ صفحات پر انہی وجوہات کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

[ا] نماز باجماعت کے اس خلفشار کے سلسلہ میں اس دلخراش داستان کا ذکر جناب محمد علی فاروقی نے اپنے ایک مضمون "اتحادِ اُمت کے لیے علماءِ کرام کی جدوجہد !" کے عنوان کے تحت ماہنامہ تعمیرِ انسانیت لاہور جنوری ۱۹۸۶ء میں بڑی دلسوزی کے ساتھ کیا ہے۔

مقامِ فقہ

اجتہاد کی اہمیّت اور ہماری چشم پوشی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قدر اختلافات، انتشار اور عناد کی وجہ کیا ہے۔ علامہ اقبال نے تو کہا تھا

؎ کیا تُو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں

لیکن اب صدیوں سے حالت یہ ہے کہ نہ ہماری خبر ایک ہے نہ نظر اور نہ ہی اذان ایک تو ہمارا خیال ہے اس کا جواب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کی تمام تر وجہ ہماری تقلیدی اور غیر تحقیقی فقہیں، متضاد اور وضعی روایات، فرقہ واریت سے بھری ہوئی عجمی تاریخ کتاب و سنّت کا غلط مفہوم ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام چیزوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں پرکھا جائے جو اس کسوٹی پر پوری اترے، اسے تسلیم کر لیا جائے اور جو اس کے خلاف جائے اسے رد کر دیا جائے۔ کیونکہ قرآنِ حکیم تو نازل ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ انسان اپنے متنازعہ معاملات کے فیصلے اس کی روشنی میں کرے۔ بصورت دیگر قرآن حکیم کو مرکزی اتھارٹی تسلیم نہ کرنے والی قوم کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جس کی مثال آج ہم خود ہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں آج تک متفق علیہ اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکا۔

مجلس شوریٰ کے صدر کی حق گوئی

اور یہی وہ وجہ جواز ہے جس کا اعتراف پچھلے دنوں مجلس شوریٰ کے صدر محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنی تقریر میں ان الفاظ میں کیا تھا:

"ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کیے بغیر ملک میں اسلامی نظام

کا نفاذ حماقت ہوگی۔ . . . ." انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتبِ فکر کا باہمی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے اور ہمیں زیادہ سوچ بچار کے بعد ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کر دے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ر مئی ۱۹۸۳ء)

جناب چیف جسٹس انوار الحق کا بیان

اور یہ لائحہ عمل قرآن حکیم کے علاوہ اور کوئی ہو نہیں سکتا جو پہلے سے ہی متفقہ علیہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ بہرحال اسی فقہی اختلاف کے متعلق پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق صاحب نے فرمایا کہ:

"یہ بدقسمتی کی انتہا ہے کہ آج تک اِس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اسلام کی رو سے سیاسی نظام کا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے اور آج ہم ڈھانچوں میں مبتلا ہیں کہ ایک ڈھانچا بنتا ہے ایک بگڑتا ہے۔ اِس طرح سے اسلام کا اقتصادی نظام، سماجی عدل و انصاف کا نظام، اسلامی قوانین، سب پر اس قدر فقہی اختلافات ہیں۔ پھر ایک ہی فقہ کے لوگوں کے اندر آپس کے اختلافات ہیں۔ کچھ لوگ اس قدر تعصب اور تنگ نظری سے کام لینا چاہتے ہیں کہ نئی نسل میں اسلام سے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔" پھر فرمایا: "پاکستان میں یہ غلطی کی جا رہی ہے کہ اصولوں کا مطالعہ کرنے اور ان کی روح کو نافذ کرنے کی بجائے کوشش یہ ہو رہی ہے کہ چودہ سو سال پہلے کی چیزوں کو اسی طرح اس دور میں بھی نافذ کیا جائے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۹ر جون ۱۹۸۳ء)

چنانچہ اس کا حل پیش کرتے ہوئے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں فرمایا کہ "صرف اکثریت کی بنیاد پر کوئی فقہ نافذ نہیں کی جا سکتی۔ (اس لیے) اجتہاد کی بنیاد پر تمام فقہوں کو ملا کر مشترکہ فقہ تشکیل دی جائے۔"

لیکن ہمارے ہاں — یہ کوشش کس شکل میں اور کس جوش و جذبہ سے کی جا رہی ہے اس کا اندازہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والی اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے۔

"راولپنڈی (نمائندہ جنگ) پاکستان متحدہ سنّی محاذ کے زیرِ اہتمام یہاں پاکستان سنّی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے ملک بھر کے علماء نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان کو مکمل سنّی سٹیٹ قرار دیا جائے جبکہ اقلیتوں کو قرآن و سنّت کے مطابق وہ حقوق دیئے جائیں جو دیگر اسلامی ممالک میں انہیں حاصل ہیں۔ کنونشن کے پہلے اجلاس کی صدارت قومی اسمبلی

کے رکن مولانا عبدالحق نے کی۔ جبکہ دوسرے اجلاس کی صدارت متحدہ سنّی محاذ پاکستان کے کنوینر مولانا محمد عباس عبدالستار تونسوی نے کی۔ بعد ازاں جامعہ حنفیہ انوار العلوم پر ایک جلسہ عام ہُوا جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ کنونشن نے مشترکہ طور پر قرارداد منظور کی کہ سنّیوں کے تمام مکاتبِ فکر اپنے فروعی اور جزوی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ سنّیوں کے مطالبات کے لیے جدّوجہد کرنے پر مرکوز کر دیں۔ نیز کنونشن میں ان مطالبات کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ اگر یہ مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو (ہم) سڑکوں پر آنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

اور اس سے قبل روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ اگست ۱۹۸۵ء کے مطابق

"سنّی مجلسِ عمل کے زیرِ اہتمام منعقدہ خلافتِ راشدہ کانفرنس نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ماتمی جلوسوں پر فوری طور پر پابندی عائد کی جائے اور اذان و کلمہ طیبہ میں کمی بیشی کو فوراً خلافِ قانون قرار دیا جائے۔ نیز یہ کہ مرتد کی شرعی سزا (قتل) نافذ کی جائے۔"

اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد مجلس عمل کے چیف آرگنائزر علامہ عبدالمجید ندیم نے کہا کہ:

"فرقہ وارانہ نفرتوں کا سیلاب ہماری قومی زندگی کے لیے عظیم خطرہ ہے۔" نیز آپ نے فرمایا کہ:

"پاکستان میں واقع اکثریت کے عقائد پر مبنی پبلک لاء کے نفاذ سے کوئی بحران پیدا نہیں ہوگا۔"

اور روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۸۵ء کے حوالہ سے یہ خبر بھی ملاحظہ فرمائیں کہ:

"کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے صوبائی کنونشن میں جو جامعہ نعیمیہ لاہور میں پیر سیّد برکات احمد کی صدارت میں منعقد ہُوا ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں اہلِ سنّت کی حکومت ہونی چاہیئے نیز اوقاف کا انتظام بھی اہلسنّت کے سپرد کیا جائے۔"

لیکن پرویز صاحب کے الفاظ میں:

"جب تک آپ اِس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں۔ آپ قرآن کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتے تو اُس کی رُو سے صراطِ مستقیم ایک ہی ہے جب اُمت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراطِ مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا۔" ۶/۵۴

"دین تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن جب فرقہ بندی میں اس کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں مذاہب کہا جاتا ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" جنوری ۱۹۸۶ء)

(اور اس طرح) جب دین مذہب میں تبدیل ہو جائے تو انسانی آزادی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ (۹/۳۱)

مفتی جعفر حسین صاحبؒ کا انٹرویو

ان فقہی اختلافات کو (جن کی بنا پر ملّت کا شیرازہ بکھر چکا ہے) ہم نے کس قدر اہمیت دے رکھی ہے اِس کے لیے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے قائد جناب مفتی جعفر حسین[1] کا وہ خصوصی انٹرویو دیکھنا ضروری ہے جو روزنامہ جنگ لاہور نے مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۳ء کے اداریہ میں شائع کیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"شیعہ سنّی اختلافات طبعی ہیں ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ مخصوص چیزوں پر عائد ہوتی ہے جبکہ دوسری فقہ میں ایسا نہیں۔ زکوٰۃ کے طریقِ کار پر بھی ہمیں اختلاف ہے ہمارے اور اہلِ سنّت والجماعت کے ہاں اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ اموال ظاہر پر لی جاتی ہے اموال باطنہ پر نہیں۔ روپیہ چونکہ اموال باطنہ میں شامل ہے لہٰذا حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر زکوٰۃ لے۔"

اور بقول اداریہ نگار روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۳۱ر اگست ۱۹۸۳ء جناب مفتی صاحب ہی کے ایما پر جنرل ضیاء صاحب کی حکومت نے شیعہ حضرات کو فقہ جعفریہ کے مطابق زکوٰۃ اور عشر سے مستثنیٰ قرار دیا۔ عشر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی جعفر حسین نے کہا کہ "حکومت صرف سرکاری زمین پر عشر لے سکتی ہے۔ نجی ملکیت کی زمین پر حکومت کو عشر لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

سکول میں اسلامیات کے نصاب کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "یہ الگ ہونا چاہیئے شیعوں کی شیعہ دینیات اور سنّیوں کے لیے سنّی دینیات۔ اگر دونوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تو وہ کبھی دینیات نہیں رہے گی نہ سنّی رہے گی نہ شیعہ رہے گی کچھ بھی نہیں رہے گی۔"

جب ان سے کہا گیا کہ آیا اس سے پاکستانی بچوں کے اندر شروع ہی سے فرقہ وارانہ احساسات پیدا نہیں ہو جائیں گے تو انہوں نے کہا "شیعہ بچہ شیعہ ہے اور شیعہ ہی رہے گا۔ سنّی بچہ سنّی ہے اور وہ سنّی ہی رہے گا۔"

---

[1] یاد رہے کہ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی تھے اور بقول اداریہ نگار جنگ آپ نے تبلیغ و اشاعتِ دین کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصّہ لیا۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳۱ر اگست ۱۹۸۳ء)

انہیں بتایا گیا کہ ایک تجویز یہ ہے کہ ایک متفق علیہ فقہ مرتب کی جائے۔ جسے فقہ پاکستان کہا جاسکتا ہے۔ اِس پر آپ کی رائے کیا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کوئی نئی فقہ مرتب نہیں کی جاسکتی اور ایسا کرنا نادانی ہوگی۔ یہ بے معنی تجویز ہے۔ عالم اجتہاد تو کرسکتے ہیں لیکن بالکل نئی فقہ مرتب نہیں کی جاسکتی۔"

انہوں نے مطالبہ کیا کہ " مذہبی اداروں مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، شریعت فیکلٹی وغیرہ میں جہاں اسلام کا کام ہوتا ہے اور قوانین کے لیے سفارش ہوتی ہے وہاں ہم اپنا حصہ مانگتے ہیں۔"

اور پاکستان شیعہ کانفرنس کے صدر جناب سید ہادی علی شاہ صاحب نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: " پاکستان کے تمام مذہبی فرقے اپنے فقہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے تشخص کو برقرار رکھیں اور ملک کی سالمیت اور تحفظ کے لیے متحد ہوجائیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء)

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ

اور دوسری طرف روزنامہ جنگ مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۸۵ء کے مطابق:

" لاہور (پ ر) تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے وفاقی حکومت کی نامزد کردہ ۱۶ رکنی کمیٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ تحریک کی سیاسی کمیٹی کے ایک اخباری بیان میں کہا گیا ہے کہ ایسی کمیٹی کی تشکیل کا کوئی جواز نہیں کیونکہ اہلِ تشیع کے مطالبات بالکل واضح ہیں اور ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی سیاسی کمیٹی نے کہا ہے کہ ملتِ جعفریہ کا مطالبہ ہے کہ حکومت ۶ جولائی ۱۹۸۰ء کے معاہدہ اسلام آباد پر عمل کرے اور پولیس ایکٹ دفعہ ۳۰ (۳) کی ترمیم فوری طور پر واپس لے۔ دریں اثنا تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے کوئٹہ کی صورتِ حال سے مؤثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے فوری طور پر ایک ایکشن کمیٹی تشکیل دے دی ہے۔ ایکشن کمیٹی کے ایک ترجمان نے اسلامیانِ پاکستان سے اپیل کی ہے کہ وہ ۱۹ جولائی کو ملک بھر میں منعقد ہونے والی تعزیتی اور احتجاجی مجالس میں بھاری تعداد میں شریک ہوکر شہدائے کوئٹہ کو عملاً خراجِ تحسین پیش کریں۔ تحریک کی لاہور شاخ کے پریس ریلیز کے مطابق آج سہ پہر چار بجے کربلا گامے شاہ میں ایک تعزیتی و احتجاجی تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

اور اس کے بعد اخبارات میں آنے والی خبروں کے مطابق کوئٹہ کے حالیہ واقعات میں ملوث ۲۳۱ کے لگ بھگ ایسے افراد کی نشاندہی ہوتی ہے جن کا تعلق ایران سے ہے۔ ضلعی انتظامیہ نے انہیں گرفتار کرکے حکومت

ایران کے حوالے کرنے کے لیے آئی۔ جی جیل خانہ جات بلوچستان کی نگرانی میں تفتان پہنچا دیا۔

وذاقی مذہبی امور کے جناب مقبول احمد خاں صاحب نے سچ کہا ہے کہ "فرقہ واریت ختم نہ ہوئی تو ملک میں اُندلس کی تاریخ دہرائی جائے گی" (بحوالہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۶ جولائی ۱۹۸۵ء)

.. مقبول احمد خاں صاحب کے اس خیال کی تصدیق ستمبر ۱۹۸۶ء میں ماہِ محرم کے دوران ملک میں ہونے والے ان واقعات سے ہوتی ہے جنہوں نے پورے ملک کو خوف و حزن کی سیاہ چادر میں لپیٹ لیا تھا اور جس کی مختصر تفصیل روزنامہ جنگ لاہور کے مدیر نے اپنے ہاں بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

"پھونک ڈالے گی چمن کو آتشِ پیکار یہ"

عاشورہ محرم اور اس کے اگلے روز لاہور، ڈیرہ اسماعیل خاں، اور خیرپور ٹامیوالی میں انتہائی ناخوشگوار واقعات کے بعد لاہور کے متاثرہ علاقوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور لاہور کے متاثرہ علاقوں میں فوج طلب کر لی گئی ہے۔ صوبائی وزیر اوقاف ملک خدا بخش ٹوانہ کی ایک پریس بریفنگ کے مطابق ان ہنگاموں میں چند افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔"

اِن حالات میں جہاں تک پاکستان میں ناجائز اسلحہ کی بھرمار کا تعلق ہے تو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۵ء کے اداریہ کے مطابق:

"ناجائز اسلحہ کی بھرمار

وزیرِ داخلہ محمد اسلم خٹک نے اگلے روز قومی اسمبلی میں بتایا کہ ایک اندازے کے مطابق قبائلی اور دیر کے علاقوں میں تقریباً ۳ لاکھ روسی اور چینی ساخت کی کلاشنکوفیں پہنچ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ راکٹ، لانچرز، ٹینک اور طیارہ شکن راکٹ گنوں اور ٹائم بموں سمیت سینکڑوں اقسام کے خودکار ہتھیار بھی یہاں پہنچے ہیں اور اس امر کی تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ قبائلی سردار ملک ولی خان کوکی خیل کا ریل انتظامیہ سے ہتھیار وصول کرتا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قبائلی علاقوں پر حکومت کا مکمل اختیار نہیں اور اس علاقے میں ہتھیاروں کی آمد کی وجہ بھی یہی ہے۔"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تجویز

ان حالات میں جہاں تک قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تعلق ہے تو آپ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :

"پاکستان میں نفاذِ شریعت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے فقہی اختلافات کا ایک ہی حل ممکن ہے کہ دستوری طور پر پاکستان کو سنّی اسلامی ریاست قرار دیا جائے۔ کیونکہ اس ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اہلِ سنّت والجماعت پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ اسلام کا معیار و مطلوب تو یہی ہے کہ مسلمان ایک متحد اور مربوط اُمّت بن کر رہیں، لیکن عملی اعتبار سے، سُنّی اور شیعہ اختلافات کی نوعیت اتنی حقیقی اور تاریخی ہے کہ ان کو دستوری اور قانونی سطح پر تسلیم کیے بغیر، نفاذِ شریعت کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔" انہوں نے ہمسایہ ملک، ایران کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح ایران نے جعفریہ فقہ کو ملکی قانون قرار دے دیا ہے، پاکستان میں حنفی فقہ کو ملکی قانون قرار دیا جائے۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور بابت ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء)

یعنی کسی دوسرے کی طرف سے نہیں بلکہ قرآن اکیڈمی کی طرف سے قرآنی فقہ کے نفاذ کی بجائے تجویز یہ پیش کی جارہی ہے کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کردی جائے۔

نوائے وقت میں دیئے گئے اِس بیان کے علاوہ روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین مورخہ ۱۴ تا ۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جنگ فورم کی طرف سے جب یہ سوال کیا گیا کہ :

س : مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہیں۔ آپ سب فرقوں کی فقہ کے لیے مشترکہ فارمولا کیا بنائیں گے۔

تو اِس پر آپ نے جواب دیا بنیادی طور پر قانون تو سنّی فقہ کا ہوگا کیونکہ یہاں سُنّیوں کی اکثریت ہے باقی سب فرقوں کو ان کے پرسنل لاء کے حوالے سے یہ اجازت ہوگی کہ وہ اس پر عمل کریں۔ لیکن پبلک لاء سُنّی فقہ کے مطابق چلے گا۔ میں تو کہتا ہوں تمام فرقوں کی رجسٹریشن کرنی چاہیئے۔ اور ہر فرقہ کا اپنا بورڈ بن جانا چاہیئے۔

مولانا عبدالستّار خان نیازی صاحب کا بیان

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے علاوہ مولانا عبدالستّار خان نیازی صاحب نے روزنامہ نوائے وقت

لاہور مورخہ یکم نومبر ۱۹۸۶ء کے حوالے سے فرمایا تھا کہ "ملک میں فقہ حنفی کے سوا کسی فقہ کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔"

اور جہاں تک جمعیت علماء پاکستان کا تعلق ہے تو ان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خاں نیازی کے علاوہ اس جماعت کے نائب صدر پروفیسر شاہ فرید الحق نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ملک میں حنفی فقہ کو پبلک لا قرار دیا جائے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کا پروگرام

(روزنامہ نوائے وقت، ۱۷ جون ۱۹۸۸ء)

وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے ۹ جولائی ۱۹۸۸ء کو یہ اعلان کر دیا تھا کہ

"ہمارا دور آئے دیں ہر فقہ کو مکمل آزادی ملے گی" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ جولائی ۱۹۸۸ء

حنفی فقہ کی حقیقت

کے مطابق:

لیکن اگر اب یہ جاننا مقصود ہو کہ فقہ حنفی کی حقیقت کیا ہے؟ تو ماہنامہ طلوع اسلام (بابت ستمبر ۱۹۸۶ء)

"امام ابو حنیفہؒ نے اپنی فقہ قرآن مجید کے حوالے سے مرتب کی تھی اس سے چونکہ مفاد پرستوں کے مفاد پر ضرب پڑتی تھی، اس لیے اس طبقے نے ان کی مدون کردہ فقہ کو بعد کے مسلمانوں تک پہنچنے نہ دیا۔ علامہ شبلی کی تو یہی تحقیق ہے کہ ان کی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ اور عقائد کی کتاب 'الفقہ الاکبر' جو امام صاحب کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ان کی تصنیف نہیں ہے۔ آج کل جو فقہ، فقہ حنفی کے نام سے مشہور ہے وہ امام صاحب کے شاگردوں قاضی ابو یوسف صاحبؒ اور امام محمدؒ کی مرتب کردہ ہے۔ اس فقہ میں بلاشبہ کہیں کہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اقوال موجود ہیں۔ لیکن ان کے جن فتاوی سے مفاد پرست طبقے پر زد پڑتی تھی، ان میں سے کئی ایک کا ذکر حنفی فقہ میں تو موجود نہیں لیکن دوسرے فقہی مذاہب کی کتابوں میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔"

جناب مودودی کا اعتراف

یہی وجہ ہے کہ مودودی مرحوم نے فقہ حنفی کے متعلق یہ فرمایا کہ:

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہب میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو بمنزلہ شاستر بنا رکھا ہے۔"[1] (بحوالہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان حقائق کا اس طرح روز روشن کی طرح واضح ہو جانے اور انہیں تسلیم کرنے کے باوجود انہی حضرات کی طرف سے پھر بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ کیونکہ ملک کی اکثریت فقہ حنفی کی

---

[1] یہ الگ بات ہے کہ مودودی صاحب مرحوم نے اس کے باوجود اکثریت کی بنا پر ملک میں فقہ حنفی کو ہی نافذ کرنے کا مشورہ دیا تھا جبکہ انہیں کے نزدیک یہ فقہ "بمنزلہ شاستر" بھی تھی۔

پیرو ہے اس لیے اس فقہ کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے اور اس کی اطاعت ہر فرقے پر لازم ہو (بحوالہ "پاکستان میں سیکولر اسلام" شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام لاہور)

مودودی صاحب مرحوم کے اس بیان اور تجویز پر اہلِ حدیث نے جس قدر مخالفت کی تھی، اس وقت کے اخبارات اس پر شاہد ہیں۔

قارئین حضرات جناب مودودی صاحب مرحوم کے اوپر والے بیان کو بھی پیشِ نظر رکھیں اور اور اسی جماعت کے سیکرٹری جنرل اور سینیٹر قاضی حسین احمد کی طرف سے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والے بیان کو بھی ملاحظہ فرمائیں کہ: "۳۱ علماء (جن میں خود مودودی صاحب مرحوم بھی شامل تھے) کے ۲۲ نکات دینی جماعتوں کے اتحاد کی بنیاد بن سکتے ہیں۔" یعنی وہ ۲۲ نکات جو مختلف فرقوں اور فقہوں کو برقرار رکھنے کے لیے مرتب کیے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی ۲۶ مارچ ۱۹۸۶ء کو موچی گیٹ کے جلسۂ عام میں آپ کا یہ فرمان کہ: "پوری اُمت کو حصّوں میں بانٹ دیا گیا ہے لیکن ہم مسلمانوں کو ایک اُمت بنانا چاہتے ہیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۷ ۳/۸۶)

نہ معلوم وہ کون سا نسخہ کیمیا ہے کہ جس کے تحت "مسلمہ اسلامی فرقوں" کی آبیاری کا سامان بھی مہیا ہوتا رہے اور پھر اُمت واحدہ بھی تشکیل پا جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب مودودی صاحب مرحوم اس امکانی صورت سے بخوبی واقف تھے کہ کوئی فرقہ اپنے اُوپر کسی دوسری فقہ کو مسلط نہیں ہونے دے گا۔ اور اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی گزرے ہوئے زمانہ کی مرتب کردہ جزئیات کو ہمیشہ کے لیے نافذ العمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا انہوں نے اِس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا کہ:

"مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں رہ سکتا اور نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال میں تمام حالات کے مطابق ہے"

(بحوالہ تفہیمات۔ حصہ دوم ایڈیشن ۱۹۵۱ء صہ ۲۴۶)

مودودی صاحب کا نقطۂ نظر بسلسلہ اکثریت

جہاں تک اکثریت کے بل بوتے پر فقہ حنفی کے نفاذ کا تعلق ہے اور اکثریت کی حقیقت کو کسی حد تک قابلِ اعتماد اور قابلِ قبول سمجھا جا سکتا ہے تو اس سلسلہ میں مودودی صاحب کی یہ تحریر پیشِ خدمت ہے:

"اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ

ایک شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ۔" (بحوالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" صہ ۴۵/۴۶)

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

یہی چیز اور یہی عوامل خود امام ابوحنیفہ کے پیشِ نظر تھے جس کو خطیب بغدادی صاحب نے اپنی تاریخ جلد ۱۴ صفحہ ۳۵۰ پر تحریر کیا ہے۔ امام نقی فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحب فرماتے ہم اسے لکھ لیا کرتے۔ ایک دن امام صاحب نے امام یوسف سے فرمایا کہ تیرا ستیاناس ہو جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اس سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ کو ابویوسف سے فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطاکار ہوں یا مصیب۔" یہی وجہ ہے کہ فقہا کے سرخیل جناب امام ابوحنیفہ نے فقہ حنفی کے نام پر کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ بزرگ آنے والی نسلوں کو اپنے فہم کا پابند نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تدبر فی القرآن اور مشاورت کی تعلیم کسی خاص دور کے لیے مختص نہیں ہو سکتی۔

علامہ اقبال کی تعلیم

امام ابوحنیفہ کے اس مسلک پر علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "امام اعظم ابوحنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے ہیں اپنی فقہ میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا" اور پھر مزید فرمایا "ان حالات کی روشنی میں میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے مطابق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہ کا طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لیے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔"

پروفیسر عثمان

اجتہاد کے بارے میں پروفیسر عثمان صاحب نے اپنے ایک مضمون میں دیت کی مثال دیتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا وہ بھی یقیناً غور و فکر کا متقاضی ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ:

"بلاشبہ حقیقی نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے دیت ادا کرنے کا حکم دیا مگر مقدارِ دیت بیان نہیں کی۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ قرآن نے مقدارِ دیت کیوں مقرر نہیں کی؟ اس ضمن میں سکوت کیوں فرمایا؟ کیا یہ سکوت سکوتِ حکیمانہ نہیں؟ کیا قرآن قرآن حکیم نہیں؟ واضح لفظوں میں حکم ہوا کہ دیت ادا کرو مگر یہ نہ بتایا کہ کتنی! اس سوال پر پوری اسلامی تاریخ میں دو واضح، دو ٹوک راستے نکلتے ہیں۔ ایک راستہ حضرت عمر فاروق رضؓ امام ابو حنیفہ رحؒ، شاہ ولی اللہ، سرسید اور اقبال کا ہے اور دوسرا جمہور علماء کا۔ پہلا مکتبہ فکر لگی لپٹی رکھے بغیر یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ عبادات و اخلاق و عقائد کے سوا جہاں تک قانون اور قانون سازی کا تعلق ہے۔ قرآن نے جو چھوٹ، اجازت، رعایت اور استحقاق مسلمانوں کو بخشا ہے اس کا دروازہ قیامت تک آنے والی مسلمان نسلوں کے لیے کھلا ہے جس طرح قرآن ہمیشہ کے لیے ہے اسی طرح اس کی اجازتیں اور رعایتیں اس کے بخشے ہوئے حقوق و اختیارات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر ایک نسل ان سے اپنی عقل و دانش اور اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق فائدہ اٹھاتی ہے تو وہ اس رعایت و اجازت اور بخشش و کرم کو آنے والی نسلوں کے لیے بند نہیں کر سکتی۔ آنے والی ہر نسل اپنی عقل و دانش اور عصری تقاضوں کے مطابق خود ان اجازتوں سے فائدہ اٹھانے کا ناقابلِ انتقال حق رکھتی ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳ جون ۱۹۸۴ء)

فقہی اختلاف کی چند ایک مثالیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان فقہی اختلافات کے سلسلہ میں ایک دو مثالوں کا ذکر کر دیا جائے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے مثلاً ۱۹۸۰ء میں مملکت پاکستان کی طرف سے پبلک لاء کی حیثیت سے جب زکوٰۃ اور عشر کا قانون رائج کیا گیا تو شیعہ حضرات کے احتجاج کے علاوہ اہلحدیث کی مرکزی جمعیت کی طرف سے جو صدائے احتجاج بلند ہوئی اسے روزنامہ مساوات اپنے ہاں شائع کیا تھا اور وہ یہ کہ:

"مرکزی جمعیت اہلحدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو تقریباً

ایک کروڑ اہلحدیث، اہل تشیع کی طرح بنکوں سے رقم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج پریس کانفرنس سے استفسار کیا کہ آیا صدرِ مملکت اِس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ عشر اور زکوٰۃ کی شرائط، نصاب اور مصارف کے سلسلہ میں جس طرح اہلِ تشیع کو اہلِ سنت سے اختلاف ہے اسی طرح زکوٰۃ عشر کے بیسیوں مسائل جن میں اہلحدیث اور فقہی ماہرین کے ساتھ شیعہ، بریلوی اور دیوبندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہلحدیث کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، حنفی علماء چاہے بریلوی ہوں یا دیوبندی، فقہ حنفی سے ہی راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے، لیکن اہلحدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف اور صرف قرآن و حدیث ہی واجب العمل ہے۔ ان حالات میں کونسلروں کے طے کردہ قواعد اور ضابطے اہلحدیث کے نزدیک نہ کسی اہمیت کے حامل ہوں گے نہ کسی اعتماد کے قابل۔"

چنانچہ ان فقہی اختلافات کی بنا پر حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق زکوٰۃ اور عشر دے سکتا ہے ——— (زکوٰۃ اور عشر کے متعلق تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی)

فقہی اختلافات کا نتیجہ

صد افسوس کہ ان فقہی اختلافات کی بنا پر آج تک یہ بھی متعین نہیں ہو سکا کہ قانون وراثت کی صحیح صورت کیا ہے، چوری کرنے والے کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیئے۔ وضو کا صحیح طریق کیا ہے شراب کی متفقہ علیہ تعریف کیا ہے؟۔ جَو کا پانی شراب ہے یا انگور کا؟ زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے؟ کیا رجم کی سزا درست ہے یا صرف کوڑوں کی؟۔ ربوٰ کے سلسلے میں صرف محنت کا ماحصل ہی جائز ہے یا روپیہ کا؟ کیا اسلام میں مضاربت کی اجازت ہے یا نہیں؟ کونسی اذان درست ہے اور کونسی نہیں؟ نماز میں ہاتھ چھاتی پر ہونے چاہئیں یا زیرِ ناف؟ آمین اونچی آواز میں کہنی چاہیئے یا آہستہ۔ وصیت کتنے مال کی کی جاسکتی ہے اور پھر اس کی صورت کیا ہو گی۔ گیارہویں شریف کا ختم حلال ہے یا حرام؟ کیا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے یا ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے؟ یتیم پوتے کا وراثت میں حصّہ ہوتا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ بقول علامہ محمد اسلم جیراج پوری (مرحوم)

"اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں

میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔" ۶۶ (بحوالہ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۳ء)

شریعت بل کے نمایاں پہلو

ہمارے ہاں فقہ کے اِس جمود کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا کوششیں ہو رہی ہیں اس کا اندازہ اس شریعت بل کے مطالعہ سے ہو سکے گا جو اِن دنوں پاکستان میں پورے زور و شور سے زیرِ بحث ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے جناب اصغر علی گھرال کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کرنا ہوگا جو روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت مورخہ ۵/۸۶ء کو شائع ہوا:

"نفاذِ شریعت بِل رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا گیا ہے۔ بعض مذہبی حلقے اس پر ناراض ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ اسلام یا شریعت کا نفاذ اس ملک میں کبھی بھی متنازعہ فیہ نہیں رہا، اس لیے اس بل کو جوں کا توں منظور کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ اب وہ اس بل کی حمایت میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے زبردست مہم چلا رہے ہیں۔ البتہ خواتین کی بعض تنظیموں نے اس کے خلاف ضرور صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کو "سیکولرازم" اور "مغرب زدگی" کا طعنہ دیا گیا۔ اب کچھ دیگر مسالک کے علماء نے جن میں فقہ جعفریہ کے علماء پیش پیش ہیں، اس کی بیشتر دفعات کو قابلِ اعتراض قرار دے کر تنبیہہ کی ہے کہ اگر اِس بل کو منظور کیا گیا تو اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن کی جائے گی۔

بل کے نمایاں پہلو

اِس پر مفصل بحث سے قبل بل کے نمایاں پہلو ملاحظہ کریں۔

(۱) وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت و فیصلہ بلا استثناء تمام امور و مقدمات پر حاوی ہوگا۔

(۲) مقننہ کوئی ایسا قانون یا قرارداد منظور نہیں کر سکے گی جو شریعت کے احکام کے خلاف ہو۔ اگر کوئی قانون یا قرارداد منظور کر لی گئی تو اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

(۳) ملک کی عدالتیں تمام امور و مقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند رہیں گی۔

(۴) تمام عدالتوں میں حسبِ ضرورت تجربہ کار، جید اور مستند علماءِ دین کا بحیثیت جج و معاونینِ عدالت تقرر کیا جائے گا۔

(۵) شریعت سے مراد دین کا وہ خاص طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے اور شریعت کا اصل ماخذ قرآن پاک اور سنتِ رسولؐ قرار دے کر ان احکام کو شرعی تصور کیا گیا ہے جو اُمت کے مسلّم اور مستند فقہاء نے اجماعِ امت کے قیاس و اجتہاد کے ذریعے مستنبط کر کے مدوّن کیے ہیں۔

(۶) قرآن و سنت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جو اہلِ بیت عظام، صحابہ کرام رضؓ اور مستند مجتہدین کے علمِ اصولِ تفسیر اور علمِ اصول حدیث کے مسلّمہ قواعد و ضوابط کے مطابق ہو۔

اس کے بعد تحریر ہے کہ:

"ان دفعات کے سرسری مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مطمحِ نظر پاکستان کے اندر قرآن و سنۃ کی بالادستی نہیں ہے بلکہ قرآن و سنۃ کی مخصوص آڑ میں ایک مخصوص گروہ کی مذہبی پیشوائیت کی بالادستی قائم کرنا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے جہاں پہلے ہی مقننہ کوئی قانون قرآن و سنۃ کے خلاف منظور کرنے کی مجاز ہی نہیں۔ قرارداد مقاصد آئین کا حصہ بنا دی گئی ہے اور تمام موجودہ قوانین کو قرآن و سنۃ کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے۔

مگر یہ قرار دینا کہ صرف انہی احکام کو شرعی تصور کیا جائے گا جو کسی مخصوص دور کے فقہاء نے مدوّن کیے تھے، اجتہاد کے دروازے عملاً مستقل طور پر مقفل کر دینے کے مترادف ہے جس کے بغیر پاکستان ایک ماڈرن اسلامی جمہوری ریاست کی بجائے تھیوکریسی پر مبنی قرون وسطیٰ کی ایک ایسی ریاست میں تبدیل ہو جائے گا جہاں عوام یا ان کے منتخب نمائندوں کی بجائے اقتدار عملاً مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیا جائے گا۔"

جناب پیر پگاڑا کا اظہارِ خیال

یہی وہ خدشات تھے جن کے پیشِ نظر مسلم لیگ کے مقتدر لیڈر جناب پیر پگاڑا صاحب نے کہا کہ:

"شریعت بل کی منظوری پاکستان میں ایک سے زیادہ شریعتوں کی راہ ہموار کرنے کا حرفِ آغاز ہوگا۔ ہم ہر قیمت پر اس کی مذمت کریں گے اور فرقوں کے نام پر پاکستان کو تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

پیر پگاڑا نے انتہائی دکھ بھرے لہجہ میں کہا کہ برائے خدا پاکستان میں دین کے نام پر اتنی تقسیم مت کی جائے جس کے نتیجہ میں اب کی بار ملک کے دین کے نام پر ٹوٹنے کا خدشہ پیدا ہو جائے۔"

لیکن پگاڑا صاحب کے اس بیان پر جماعتِ اسلامی کی طرف سے شدید ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ ۷ر جولائی ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد میں ایک جلوس میں پیر پگاڑا صاحب کا پتلا جلایا گیا اور اس کے جواب میں مسلم سٹوڈنٹس اور حُر جماعت کی جانب سے شدید احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ جماعتِ اسلامی کے خلاف نعرے لگائے گئے اُسے سامراج کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ صوبہ سندھ کے متعدد شہروں مثلاً سانگھڑ، شہداد پور، کھنڈو کھپرو، ٹنڈو آدم خاں وغیرہ میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ جلوس نکالے گئے اور جوابی کارروائی کے طور پر جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمدؒ کے پتلے نذرِ آتش کیے گئے۔ (بحوالہ "طلوعِ اسلام" ستمبر ۱۹۸۶ء)

جماعتِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل قاضی حسین احمد صاحب نے جمعیت اہلحدیث کے سیکرٹری جنرل علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کے دوران جب شریعت بل کی منظوری کے لیے مذہبی جماعتوں کو مل جُل کر کام کرنے کے لیے کہا تو علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب[1] نے بھی انہیں یقین دلاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس کے لیے تیار ہیں لیکن موجودہ حکومت سے خیر کی کوئی توقع نہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۸۶ء)

---

[1] یاد رہے کہ متحدہ شریعت محاذ کے راہنما جناب چنیوٹی صاحب کے کہنے کے مطابق احسان الٰہی ظہیر صاحب نے مولانا عبداللہ درخواستی کو خط بھی تحریر کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "میں شریعت بل سے پوری طرح متفق ہوں اور اس بل کے لیے ایک سپاہی کی طرح کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱/۸۶-۱)

جبکہ اس کے برعکس روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جناب احسان الٰہی ظہیر صاحب کا یہ بیان بھی شائع ہوا کہ "اہلحدیث شریعت بل کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ (نیز یہ کہ) آئندہ اس ملک پر اہلحدیثوں کا جھنڈا لہرائے گا۔"

اور اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر باقی تمام فرقوں والے بڑے شریفانہ طریق سے اپنے اپنے جھنڈے سمیٹ کر گھروں کو چلے جائیں گے۔ قارئین خود ہی یہ فیصلہ کریں کہ ان مختلف بیانات کے پیشِ نظر ہم کس کو مجرم قرار دیں اپنے آپ کو یا نوجوان نسل کو۔

لیکن دوسری طرف اسی اخبار کے حوالے سے قومی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر خواتین کے مظاہرے کے علاوہ ویمنز ایکشن فورم (خواتین محاذِ عمل) لاہور کے اجلاس میں خواتین محاذِ عمل (راولپنڈی) کی طرف سے شریعت بل اور نوین ترمیمی بل کے خلاف اپیل کی تائید کی اور کہا کہ: "میاں طفیل مسلمانوں کے عقیدہ اور ضمیر کے واحد محافظ نہیں۔"

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کے روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت کے مطابق جماعتِ اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلسِ عاملہ نے اپنی ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا کہ: "شریعت بل پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں منظور کیا جائے۔"

مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) بشیرالدین احمد صاحب کا بیان

لیکن شریعت بل کے ہی متعلق مورخہ ۲۴/۶/۸۶ کو روزنامہ جنگ لاہور کی وساطت سے جناب مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) بشیرالدین احمد صاحب کا بیان جاری ہوا کہ:

"جن لوگوں کو شریعت کا بخار چڑھا ہوا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ شریعت بل آئے لیکن موجودہ آئین کی موجودگی میں شاید مزید کسی ایسے بل کی ضرورت نہیں۔ ایسے بل کے آنے سے جھگڑے اور اختلافات کا امکان ہے۔"

انہوں نے مزید فرمایا کہ: "میرے خیال میں اسلام ایسا مذہب ہے جو ہمیں آگے لے جانا چاہتا ہے لیکن ہم ہیں کہ پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔"

مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب کا بیان

روزنامہ جنگ لاہور مورخہ یکم نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب نے فرمایا کہ: "قیامِ پاکستان کے مخالفین اب شریعت بل کے نام پر اودھم مچا رہے ہیں۔"

مصطفےٰ اعوان صاحب کا کھلا خط

شروع میں جناب اصغر علی گھرال صاحب کے مضمون کے دیئے گئے اقتباس کے علاوہ جناب مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ کے اس کھلے خط کا کچھ حصہ یہاں ضرور پیش کر دینا چاہیئے جو آپ نے معزز اراکین سینٹ کے نام تحریر کیا تھا۔ آپ کا یہ خط ہر بہی خواہ کے لیے قابلِ غور و فکر ہے۔

نفاذ شریعت بل کی مختلف دفعات

بل میں دفعہ ۲ کی کلاز (سی) "اجماعِ اُمّہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مگر یہ واضح نہیں کیا گیا کہ اجماع سے کیا مراد ہے؟ اور اُمّہ کا مفہوم کیا ہے؟ اُمّہ سے مراد آج کی اُمّتِ مسلمہ ہے؟ یا آج سے ہزار سال پہلے دورِ عباسیہ کی اُمّتِ مسلمہ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کی اُمّتِ مسلمہ! اور اسی طرح اجماع سے مراد آج کے اسلامی قانون کے ماہرین اور سکالر ہیں؟ یا ہزار سال پہلے دورِ عباسیہ کے اسلامی قانون کے ماہرین اور سکالر یا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کے زمانے کے وہ فیصلے جو اجماع کے طور پر صادر ہوئے اور وہ کہاں درج ہیں؟ کیا ان میں سے کسی دور کے اجماع کے فیصلوں کو منضبط اور مدوّن کیا گیا ہے؟ قانون کی زبان کبھی مبہم نہیں ہوتی اور اس میں ہر لفظ اور اصطلاح کا ایک متعیّن مفہوم دیا جاتا ہے۔ تاکہ قانون دان اور عدالتیں اس کے مطابق متنازعہ امور میں کوئی موقف اختیار کر سکیں۔

اس کے بعد اسی دفعہ ۲ کی کلاز (ڈی) میں کہا گیا ہے کہ تسلیم شدہ اُمّت کے مجتہدین کے قیاس اور اجتہاد کی رُو سے مُرتّب شدہ احکام، شریعت کہلائیں گے۔ اس میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اُمّت کے تسلیم شدہ مجتہدین کون ہیں؟ آج کی اُمّتِ مسلمہ کے مجتہدین، یا ہزار سال پہلے کی اُمّتِ مسلمہ کے مجتہدین یا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کے مجتہدین، مجتہدین تو ہر زمانے میں رہے ہیں اور رہیں گے۔ جو اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور موجودہ واقعات کے بارے میں اپنے اجتہاد سے کام لے کر احکام صادر کرتے رہے ہیں۔ اگر ہزار سال پہلے مجتہدین اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور موجودہ مسائل کے بارے میں اجتہاد کر کے احکام وضع کر سکتے تھے تو آج کے مجتہدین بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے لیے اجتہاد کیوں نہیں کر سکتے؟ اِس لیے اجتہاد کو موجودہ زمانے کے قانونی ماہرین اور اسکالرز کے لیے کھُلا رکھنا پڑے گا جس میں وہ سابقہ مجتہدین کے فیصلوں کو بھی نظائر کے طور پر پیشِ نظر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اجتہاد کے دروازے بند کر کے اس پر اصرار کریں گے کہ آج سے ہزار سال پہلے فقہاء نے اجتہادی فیصلوں سے جو

احکام مدوّن کر دیئے ہیں انہیں من و عن نافذ کر دیا جائے تو اس سے بڑی زیادتی اس قوم کے ساتھ اور کوئی نہیں ہو گی۔ اسی طرح اگر ہزار سال پہلے کی مدوّن شدہ فقہ میں بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق ضروری ردّ و بدل کی اجازت موجودہ دور کے قانونی ماہرین کو نہ دی گئی تو اس سے سوسائٹی میں خلفشار پیدا ہو جائے گا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں شریعت کے ماخذ چار ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ مگر میری قرآنی بصیرت میری راہنمائی کرتی ہے کہ اسلام میں قانون کا ماخذ صرف قرآنِ حکیم ہے۔ باقی تین صورتیں صرف قانون کی تدوین یا ان کے نفاذ کے طریقے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو وحی کے ذریعے جو راہنمائی دی ہے اس کی آخری اور مکمّل شکل صرف قرآن کے اندر محفوظ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے آنے والے ہر دور میں روشنی اور ہدایت فراہم کرتی رہے گی۔ قرآن میں صرف چند احکام کے علاوہ اسلامی نہج زندگی کے اصول بتائے گئے ہیں تاکہ ہر دور کے انسان اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعیّن کرتے رہیں۔ ان جزئیات کو متعیّن کرنے کا طریقہ بھی اللہ تعالےٰ نے خود ہی بتایا ہے۔ کہ اُمّت باہمی مشورہ سے اس فریضہ کو انجام دے۔ اس پر سب سے پہلے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عمل فرمایا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاءؓ نے ایسا ہی کیا۔ غور فرمائیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن کے اصولوں کے تحت ایک حکومت قائم کی تھی۔ اُن کے بعد یہی حکومت ان کے جانشینوں کو منتقل ہوئی اور جیسا کہ کوئی حکومت اپنے پیشرو حکومتوں کے فیصلوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتی اور ایک ہی انداز کی حکومت اگر مسلسل قائم رہے تو اس میں سابقہ حکومتوں کے فیصلوں کو قائم رکھا جاتا ہے اور سابقہ حکومتوں کے فیصلوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہی انداز رسول اللہؐ کے خلفاء کے زمانے میں نظر آتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدّیق رضؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ مَیں سنّتِ رسولؐ کی اتّباع کروں گا۔ اور جب حضرت عمر رضؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ مَیں سنّتِ رسولؐ اور سنّتِ ابو بکر رضؓ کا اتّباع کروں گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد انہوںؓ نے سابقہ دور کے بعض فیصلوں میں تبدیلی کی۔ تاریخ میں ہمیں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے سابقہ دور کے بعض فیصلوں میں حالات کے مطابق ضروری تبدیلیاں کیں۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے بھی وابستہ رہا اور حال کے

تقاضوں کا بھی ساتھ دیتا رہا۔ اگر اس انداز کی حکومت خلفائے راشدین کے بعد بھی قائم رہتی اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ آج تک قائم رہتا تو آج ہم جس اُلجھن میں گرفتار ہیں وہ بالکل نہ ہوتی۔ مگر یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔ دین مخصوص تصورات، مخصوص طرزِ عبادت اور چند عقائد کا نام نہیں۔ دین تو عملی زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنے کے لیے آیا تھا۔ ایک متحرک اور زندہ قوم جو تسلسلِ حیات چاہتی ہے وہ اپنے ماضی سے وابستہ ضرور رہنا چاہتی ہے۔ مگر ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا کبھی گوارا نہیں کرسکتی۔ ماضی سے وابستگی سے مراد یہ ہے ہم حضورؐ کے طرزِ عمل کو راہنما بنائیں۔ خلفائے راشدین کے تجربوں سے مستفید ہوں۔ اُمت کے مجتہدین کے اجتہاد کو بطور نظیر سامنے رکھیں۔ سابقہ دور کے فقہاء کے استدلال اور آراء کو پیشِ نظر رکھیں اور ان کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل دریافت کریں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے۔ غیر متبدل صرف خدا کی ذات ہے اور اس کی کتاب ہے اور اس کی روشنی میں حضور رسالتمآبؐ نے جس طرح عمل کیا، اُسی کو سُنّت کہتے ہیں اور حضورؐ کی اسی سُنّت کی اتباع خلفائے راشدینؓ کرتے رہے حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا۔ دوسری قوموں سے ربط و ضبط بڑھا تو کئی نئے فیصلے کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات کی گئیں۔ اس انداز کی حکومت میں قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس اپنے اپنے مقام پر رہتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی اُلجھن پیش آتی ہے اور نہ فرقہ بندی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ سب کی راہنمائی کے لیے کتاب اللہ اور اس کے نفاذ کی نظیریں سنّت، اجتماع و قیاس۔ اور یہی مفہوم حضرت عمرؓ کے اس اعلان کا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ۔

دفعہ نمبر ۱۲: بل کی دفعہ نمبر ۱۲ میں کہا گیا ہے کہ قرآن و سنّت کی وہ تعبیر قابلِ قبول ہوگی جو اہلِ بیت عظام، حضورؐ کے صحابہؓ، مسلّمہ فقہائے اُمّت اور شریعت کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق ہو میں سمجھتا ہوں کہ اس دفعہ کے ذریعے اسلام کو ایک جامد مذہب بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے بڑی زیادتی اسلام کے ساتھ اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ دفعہ تقلید اور فرقہ پرستی کی اصل رُوح ہے اور قرآن و سنّت کے مزاج کے منافی ہے۔ جن بلند ہستیوں سے منسوب قرآن و سنّت کی تعبیر کو ہمیشہ کے لیے حرفِ آخر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود ان بزرگانِ

دین نے کبھی اپنی بات کو حرفِ آخر نہیں کہا۔ قرآن خدا کا کلام اور خدا کا علم ہے۔ جس حد تک اس نے انسانوں کے لیے دیا ہے۔ نبی کے بغیر کوئی شخص اس علم کا مکمل احاطہ کر لینے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں کچھ متعین قوانین ہیں جو بالکل واضح اور بیّن ہیں ان کی کوئی دوسری تعبیر ممکن ہی نہیں۔ اور ان پر کسی کا کوئی اختلاف بھی نہیں۔ اس کے علاوہ نظامِ زندگی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں عمل فرمایا۔ اسی کو سنّتِ رسولؐ کہتے ہیں۔ انؐ کے بعد انؐ کے خلفاءؓ نے اس پر عمل کیا۔ مگر یہ سلسلہ ایک خاص دور کے بعد آگے نہ بڑھ سکا۔ چنانچہ ملّت کی گاڑی اصلی سمت سے ہٹ کر دوسری سمت روانہ ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملّت زوال اور انحطاط کا شکار ہو گئی — اور اس انحطاط اور زوال کے زمانے میں اسلام پر کیا گذری؟ یہ ایک داستان ہے الم انگیز اور حدیث ہے جگر خراش۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اتنا بتا دوں کہ :

اِیَّاکَ نَعْبُدُ (اے اللہ ہم تیرے ہی احکام کی پابندی کرتے ہیں) کے معنے ہو گئے (اے اللہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں) ۔"

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں کہ :

" اسلامی نظام کے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم متعین طور پر سمجھیں کہ اسلام کیا ہے؟ اگر یہ بات سمجھ میں آگئی تو اسلامی نظام۔ اسلامی مملکت۔ اسلامی قوانین اور اسلامی شریعت سب کچھ بآسانی سمجھ میں آجائیں گے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ اسلام کیا ہے؟ تو اس کا جواب تو خدا نے اپنی کتاب میں چار لفظوں میں دے دیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

یعنی جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

شریعت بل کے سلسلہ میں جناب اصغر علی گھرال کے مضمون کے بعد اس موقع پر اگر جناب ارشاد احمد حقّانی صاحب کے مضمون کا ایک اقتباس درج کر دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ چنانچہ حقّانی صاحب اپنے ہاں بل کی مختلف دفعات کو درج کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ :

"..... یہ ہے شریعت کی تعریف جو اِس بل میں اختیار کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کتاب و سنّت کے ساتھ ساتھ اجماع اور قیاس کو بھی شریعت کے مسلّمہ ماخذ قرار دے دیا گیا ہے اور عدالت

مقننہ دونوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ان چاروں ماخذوں کی پابندی کریں۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی لمبی چوڑی شرعی واقفیت کی ضرورت نہیں کہ اجماع اور قیاس کو بھی شریعت کے مسلّمہ ماخذ قرار دینے سے اختلافات کا ایک پنڈورا بکس کھُل جائے گا۔ اجماع اور قیاس کی اپنی تعریف اور حدود ہی متنازعہ ہیں اور مختلف فقہوں میں اجماع اور قیاس کے اپنے اپنے اصول اور نظائر ہیں۔ شیعہ سنی اختلافات تو ایک حقیقت ہیں ہی اور ان کی وجہ سے جو پیچیدگیاں شریعت کی اس تعریف کی موجودگی میں پیدا ہونا ناگزیر ہیں۔ ان سے تو کوئی مفر نہیں ہوگا۔ لیکن خود اہلِ سنت والجماعت کے اندر اجماع اور قیاس کے حوالہ سے ان گنت اختلافات ہیں۔ حنفی فقہ کے داخلی اختلافات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دو ممتاز ترین شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے متعدد اجتہادات اور فتوے مختلف ہیں۔ اہلِ حدیث اور اہلِ تقلید کے اختلافات اجماع اور قیاس کے حوالہ سے اظہر من الشمس ہیں۔ گویا شریعت بل میں دی گئی تعریف شریعت اختلافات کا ایک شاہ دروازہ کھولنے کے ہم معنی ہے۔ اور وفاقی شرعی عدالت اور دوسری عدالتوں کو شریعت کی اس تعریف کا پابند بنانے کے بعد یہ توقع کرنا کہ اختلافات اور نزاعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع نہیں ہو جائے گا، سادہ لوحی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔[1]"

قارئین شریعت بل کے سلسلہ میں دی گئی مختلف دفعات کے علاوہ مندرجہ بالا دیئے گئے تبصروں کے ایک ایک لفظ پر غور کریں اور اس کے بعد اس بل کی منظوری کے لیے کی جانے والی تمام تر تگ و تاز کے علاوہ مندرجہ ذیل سطور کا مطالعہ بھی کریں جو شریعت بل اور علماء و مشائخ کنونشن کے حوالے سے تحریر کی گئی ہیں:

شریعت بل اور علماء و مشائخ کنونشن

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جامعہ نعیمیہ لاہور میں شریعت بل کو بلا تاخیر منظور کروانے کے لیے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب کی زیرِ صدارت علماء و مشائخ کی ایک کنونشن بھی منعقد ہوئی۔ جس میں سینیٹر قاضی عبداللطیف صاحب نے کہا کہ:

"حکومت کہتی ہے کہ شریعت بل نیا لایا جائے گا مگر وہ کون لائے گا شریعت بل علماء کرام ہی مرتب کر سکتے ہیں۔" مولانا منظور احمد چنیوٹی صاحب نے فرمایا کہ:

---

[1] ان تمام حضرات کے پیش کردہ خیالات کے علاوہ قارئین اگر اس سلسلہ میں جناب عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ اور جناب ڈاکٹر یوسف گورایہ صاحب کے قابلِ قدر خیالات سے آگاہ ہونا چاہیں تو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸ نومبر ۸۶ء کی اشاعت میں جنگ فورم کی نشست کا ضرور مطالعہ کریں۔

"ہم شریعت بل منظور کرانے کے لیئے آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو اسمبلی کا گھیراؤ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔"

مولانا گوہرالرحمٰن مدنی نے فرمایا کہ "حکومت نے شریعت بل منظور نہ کیا تو نئی اسمبلی بنائی جائے گی۔"

مولانا محمد اجمل خان نے کہا کہ "متحدہ شریعت محاذ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے گا۔"

مولانا عبدالستار تونسوی نے کہا کہ متحدہ شریعت محاذ کی جانب سے شریعت بل کے نفاذ کی جدوجہد میں کمی نہیں آنے دی جائے گی۔"

مولانا معین الدین لکھوی نے کہا کہ "شریعت بل کی حکومتی مخالفت کا کوئی جواز نہیں اور ۱۹۷۳ء کا آئین نہ جمہوری ہے نہ اسلامی۔"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فرمایا کہ:

"آج کا اتحاد اتحاد کا مظہر ہے جس میں تمام مکتبِ فکر کے علمائے کرام موجود ہیں۔" انہوں نے کہا کہ "۴۰ سال بعد ملک میں شریعت کی طرف پہلی پیش قدمی ہوئی ہے۔"

اور اس کے بعد میاں طفیل صاحب امیر جماعتِ اسلامی نے بھی تقریر کی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی اس کنونشن کے علاوہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ایک پریس کانفرنس بھی طلب کی گئی جس میں مفتی محمد حسین نعیمی صاحب، مولانا حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی، مولانا محمد اجمل صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، حافظ عبدالرحمان صاحب مدنی، اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ صاحب، میاں شیر عالم ایڈووکیٹ صاحب، مولانا اشرف حکیم صاحب، اور میاں نعیم الرحمان وغیرہ نے شرکت کی۔ اس پریس کانفرنس کے دوران قاضی حسین احمد صاحب نے کہا کہ "بعض حلقوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ شریعت بل کی دفعہ ۸ جو اجتہاد کے بارے میں ہے، اختلافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ علمائے کرام کے بائیس نکات (ان پر پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے) میں دفعہ بھی وہی ہے جو شریعت بل میں آٹھویں دفعہ رکھی گئی ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۸/۱۰/۸۶)

علاوہ ازیں متحدہ شریعت محاذ کے رہنما اور رکن پنجاب اسمبلی مولانا منظور احمد چنیوٹی نے بھی روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱/۸۶ کو فرمایا کہ: "متحدہ شریعت محاذ نے ۲۲ نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت بل مرتب کیا ہے۔"

یعنی وہی لذیذ شئ جس میں فرقہ پرستی کے زہر کو تریاق بنا کر ملت کے دسترخوان پر سجایا گیا ہے العجب۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس مذکورہ شریعت بل کے سلسلہ میں لاہور کی در و دیوار پر لگائے جانے والے اشتہارات کے درمیان قرآن حکیم کی وہ آیت مبارکہ بھی درج تھی کہ جس کا مفہوم یہ تھا کہ آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو

خبر یہ ہے کہ
اِس شریعت کنونشن میں سینیٹر مولانا سمیع الحق صاحب نے شریعت بل کو پیش کرنے اور منظور کروانے کی اِس تمام تگ و تاز کے ماحصل کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :

" انتخابات کے مروجہ طریقوں سے علماء کرام اکثریت حاصل نہیں کر سکتے۔ (لہٰذا) موجودہ نظام کو بدلنے کے لیے شریعت بِل پیش کیا گیا ہے[1] "

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱/۸ ۸۷ء)

اجتہاد کی ضرورت نہیں

ظاہر ہے کہ پچھلے بیان کردہ مسائل کو صرف نظری مسائل نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ معاملات زندگی میں جنہوں نے صدیوں سے ملّتِ اسلامیہ پر ایک جمود طاری کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی ہمارا یہی کہنا ہے کہ:

" یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو آئمہ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے ۔ لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور صحیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے ۔ اس پر اُمّتِ محمدیہ کا اجماع ہے ۔"

(بحوالہ " ایشیا " ۱۴ اگست ۱۹۷۸ء)

یہ بیان جامعہ اشرفیہ لاہور کے مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب کا ہے جو آپ نے ایک سوال کے جواب میں دیا تھا۔

وارث میر صاحب کی بلند نگہی

جناب پروفیسر وارث میر صاحب نے شاید اسی قسم کے خیالات اور فتووں کے پیشِ نظر فرمایا تھا کہ :-

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۸۶ء کے مطابق شریعت محاذ کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ: شریعت بِل کے حق میں ملک گیر تحریک چلائی جائے گی۔

"علم وفن اور سائنس کا جب کبھی نیا جھونکا آتا ہے (تو) ہمارے علمائے دین کسمساتے ہوئے اپنے ذہنوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتے ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزر پاتا کہ انہیں حبس محسوس ہوتا ہے اور جوں جوں دم گھٹنے لگتا ہے تو کھڑکیاں اور دروازے توڑ دیتے ہیں اور پھر آنکھیں جھکائے یا آنکھوں پر ہاتھ رکھے بغیر وہ سب کچھ کرتے ہیں جسے چند سال پہلے کفر اور گناہ قرار دے چکے ہوتے ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۴ر جولائی ۱۹۸۵ء)

ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی تجویز

مجمع الفقہ الاسلامی (فقہ اکیڈمی) کی تاسیس کا فیصلہ تیسری اسلامی سربراہ کانفرنس منعقدہ جنوری ۱۹۸۱ء طائف میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس اسلامی فقہ اکیڈمی کا ایک اجلاس ۷ تا ۹ر جون ۱۹۸۱ء مکہ مکرمہ میں منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح شاہ فہد بن عبدالعزیز نے فرمایا۔ اس اجلاس میں ۳۹ر اسلامی ممالک نے شرکت کی۔ اس موقع پر پاکستانی مندوب کی حیثیت سے فقہ اکیڈمی کے لیے جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے جو تجاویز پیش کیں ان میں سے دیگر تجاویز کے یہ تجویز بھی شامل تھی کہ:

"یہ اکیڈمی عبادات کے متعلق کسی سوال کو اپنے ہاں زیر بحث نہ لائے کیونکہ عبادات کا تعلق عقائد سے ہے اور عقیدہ میں اجتہاد درست نہیں۔ چنانچہ اکیڈمی کو چاہیئے کہ اپنے فتاویٰ کو معاملات تک محدود رکھے" نیز آئندہ لائحہ عمل کی خاطر آپ نے تجویز فرمایا کہ "اکیڈمی کو جدید زندگی کے لیے نئے انکشافات کی روشنی میں بعض مسائل مثلاً انسانی اعضاء کی پیوندکاری، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش اور وراثت کا مسئلہ، تمثیل کاری، سینما اور تصویر کشی کے مسائل وغیرہ پر رائے دینا ہوگی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۳ء)

اجتہاد کے اس قدر جمود کے علاوہ یہ ہیں وہ "اہم ترین سوالات اور مسائل" جن میں ملّتِ اسلامیہ صدیوں سے اُلجھی چلی آ رہی ہے۔

صدر ایوب خاں مرحوم کی ایک یادگار تقریر

ہمارا یہی وہ انحطاط تھا جس کی بنا پر صدر ایوب خاں مرحوم کو ۹ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جامعہ اسلامیہ

بہاولپور کی افتتاحی تقریر کے دوران کہنا پڑا کہ :

"ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلامی فقہ کو ہی اسلام سمجھتے ہیں۔"

اور اس سے پیشتر مئی ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں علماء کے ایک اجتماع سے انہوں نے جو خطاب کیا وہ ہر صاحبِ بصیرت کے لیے غور و فکر کا متقاضی ہے یعنی یہ کہ :

"کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ مذہب نہیں تھا بلکہ ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جد و جہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔" (پاکستان ٹائمز۔ ۴ مئی ۱۹۵۹ء)

اِس کے بعد انہوں نے کہا :

"جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی، اس کے متبعین دنیائے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گزرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کیے جا رہی ہے۔ اسلام اس تفریق یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت کو مٹانے کے لیے آیا تھا لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔" (ایضاً)

انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ :

"جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی بہرحال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے۔ لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے لیکن ہمارا مذہب ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ

یہ تھا کہ اس نے بُت پرستی کا خاتمہ کر دیا لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بُت بنا دیا۔" (ایضاً . . . . .)

اِس کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

" مذہب کو یوں بُت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملّی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصرِ حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اُٹھایا ان پر "دنیادار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ پکے اور سچے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدّس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔ (ایضاً . . . . .)

اور آخر پر اپنے اِس دعوے کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے صدر مملکت نے علمائے کرام کو دعوتِ فکر دی کہ:

" مَیں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے صرف اِس لیے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اِس قسم کے بلند اور باعزّت دین کو ترقی کا دشمن علم و بصیرت کا حریف بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔" (ایضاً . . . .)

اس کے بعد اپنے استفہامیہ انداز میں ان چند ایک وجوہات کا ذکر کیا جن کی وجہ سے اسلام ایسا ترقی پسند اور زندہ دین جامد بن کر رہ گیا۔ آپ نے سوال کیا:

" ا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے اور ایسا معاشرتی

اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا ہے۔

۲۔ یا ہم نے اپنے دین کو جنوں فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

۳۔ یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے۔

۴۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔" (ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔)

چنانچہ ان سوالات کے پیشِ نظر انہوں نے علماء حضرات کو ایک مشورہ دیا اور فرمایا کہ:

"یہ سوالات بہت اہم ہیں اور ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنہوں نے اسلام کی برق آسا شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقینِ محکم کے ساتھ بے باکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔"

پرویز صاحب سے حنیف رامے کا انٹرویو

قبل اس کے کہ ہم زیرِ نظر کتاب کے کسی دوسرے باب کا مطالعہ کریں۔ اس موقع پر آج سے ۲۱ سال قبل کے ایک انٹرویو[1] کا ذکر کر دینا ضروری خیال کیا گیا ہے جو حنیف رامے صاحب (سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب) نے جناب غلام احمد پرویز صاحب (مرحوم) سے لیا تھا۔ چنانچہ جناب رامے صاحب نے آپ سے سوال کیا کہ:

---

[1] اس انٹرویو کا ذکر دوسرے مقام پر بھی آ چکا ہے۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست، معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اِس چیز کی اور کبھی اُس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، ہمہ وسعت معانی، اس کے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لیے خدا کی وحدت آفریں رسّی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہم کنار رکھتی ہیں۔

پرویز صاحب: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اُٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دورِ حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرنِ اوّل میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امّت تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ سب کے لیے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امّت کی وحدت ختم ہو گئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے با الفاظِ دیگر شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لیے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لیے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین اربابِ حکومت کے حوالے کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) اربابِ مذہب کی تفویض میں دے دیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق

معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں۔ اِس سے اربابِ حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور اربابِ مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہُوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا "اسلام" الگ الگ ہو گیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (SECULAR FORM) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامتِ دین قرار دے دیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لیے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے جسے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلامی) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عائد کر دیئے گئے ہیں ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابلِ فہم ہو سکتا ہے لیکن جب اِس قسم کی باتیں قوم کے دانش مند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کیا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> "مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لیے منفعت بخش ہو گا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسّر آجائے گا جس سے یہ اس بھٹکے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اِس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔" — اس کے بعد فرمایا:

"ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرمؐ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سرِ نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بین نگاہوں، اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لیے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خار دار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے، لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آجایا کرتا تھا۔ جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے، دینِ خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو جس میں دینِ خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے، محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظامِ حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیاتِ اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے یہی ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لیے اگر خدا کی اس کتابِ عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو اُمّت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہدِ نبی اکرمؐ میں وجہِ سرفرازیٔ امّت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ "مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لیے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لیے ہوئے اُٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ: "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام"، جنوری ۱۹۶۶ء)

"سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اشخاص کی تعمیر کی لیکن قوم سے غفلت برتی۔ ہم نے شہر تعمیر کیے لیکن ملک سے غفلت برتی۔ بالفاظِ دیگر" ہم نے سمجھا کہ ایک اچھا ملک اچھے شہروں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اچھے شہر عمدہ عمارات کا مجموعہ اور عمدہ عمارات عمدہ سنگ و خشت کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ پورا ملک سنگ و خشت کا

ایک حسین ڈھیر (تو) بنتا چلا گیا" (لیکن شکوہِ دین کی طرف توجہ نہ دی)"

جبکہ شکوہِ دین کی یہ حسین و جمیل عمارت ہمارے لیے اس وقت تک فردوسِ نگاہ بن نہیں سکتی جس وقت تک راشڈل کے الفاظ میں ہم اس بنیادی اصول کو تسلیم نہ کریں کہ:

"جو انسان خود نہ سوچے بلکہ زندگی کی تمام جزئیات میں دوسروں کی تقلید کرتا چلا جائے اس کے متعلق سمجھ لو کہ وہ ایسا انسان ہے جس میں کیریکٹر ہی نہیں"۔

بریڈلے نے تو کیا خوب کہا ہے کہ: "جو شخص اپنے ماحول سے بہتر بننے کی خواہش کرتا ہے، سمجھ لو کہ وہ حیاتِ جاوداں کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔"

انسانی عقل کے ان کوہ پیماؤں کے بعد جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے تو اس نے تو چودہ سو سال پیشتر تقلید پسندوں کی نفسیات کے پیشِ نظر فرما دیا تھا کہ:

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ وحی خداوندی کا اتباع کریں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے مسلک پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔"

جیسا کہ آپ سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک مطالبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں (اکثریت کے باعث) فقہ حنفی کی بنا پر سنّی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی جائے لہٰذا فقہ کے اس باب کا اختتام ہم اسی نکتہ پر علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت سے استفادہ کے ساتھ کرتے ہیں جس کا ذکر جناب وارث میر صاحب نے (جولائی ۱۹۸۶ء میں روزنامہ جنگ کی وساطت سے) اقساط پر پھیلے ہوئے اپنے ایک فکر انگیز مضمون "نویں آئینی ترمیم اور شریعت بل" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔

علامہ اقبال در اصل فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حقِ اجتہاد چھین کر اُسے مسلمانوں کی مجلس قانون ساز کو تفویض کرنے کے حق میں تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو خالص سُنّی مملکت کے قیام کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

"اب یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانے کے جدید تقاضوں اور اقوامِ مغرب کے سیاسی تجربہ سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان ممالک کی روح جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالس قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دورِ حاضر میں جب کہ امت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اجماع کی ممکن شکل یہی ہے کہ مذاہب فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حق اجتہاد چھین کر اسے مسلمانوں کی مجلس قانون کو تفویض کر دیا جائے۔"

اسمبلی کے ذریعے اجتہاد کی تجویز کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کی جو مجالس قوانین ساز بنائی جائیں گی۔ ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانونِ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانون شریعت کی تعبیرات کی غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سدِّ باب یا ان کے مواقع کو کم کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں ایران نے اپنے ۱۹۰۶ء کے دستور مملکت کی رو سے ایسے علماء کی جو امور دنیا سے باخبر ہوں" ایک کمیٹی قائم کی تھی تاکہ وہ مجلس قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی"۔

چنانچہ ایرانیوں کے تصورِ امام غائب کی مجبوریاں بیان کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں: "بہرحال ایران کا نظریہ دستور کچھ ہی ہو یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں۔ اگر کوئی سنّی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے، تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علماء کو مجالس قانون ساز کا رکن بنا دیا جائے تاکہ وہ قوانینِ شریعت پر آزادانہ بحث و تمحیص میں دوسروں کی معاونت اور راہنمائی کریں۔ احکامِ شریعت میں غلطیوں کے سدِّ باب کا مؤثر طریقہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ممالک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصول قانون سازی کو طلبہ کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔"

جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب اپنے ایک قسط وار مضمون "پاکستان، اقبال اور اجتہاد" میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

علامہ اقبال کے نزدیک نامزد ادارے کی مخالفت کی وجہ جواز

"علامہ اقبال نے قوم کے منتخب قانون ساز ادارے کی بالادستی کے پیش نظر کسی بھی نامزد ادارے کی مخالفت کی ہے اس مخالفت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نامزد ہونے والے اپنے نامزد کرنے والے کی منشا اور مرضی کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ نامزد کرنے والے کے اپنے افکار اور نظریات ہوتے ہیں نامزدگی سے قبل وہ اپنا پورا اطمینان کر لیتا ہے کہ ایسے افراد نامزد ہوں جو اس کے افکار اور تصورات کی ترجمانی کریں اور اگر وہ اس کے خلاف عمل کریں تو انہیں بدلا جا سکے۔ جیسا کہ وفاقی شرعی عدالت کے ایک سابق چیف جسٹس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں ایسا

انتظام بھی ممکن ہے کہ تبادلے کی نوبت ہی نہ آئے۔ لہٰذا نامزد ادارے کے افراد اپنے نامزد کرنے والے کے تابع بن کر رہ جاتے ہیں یہ عمل قوم کے مجموعی مفاد اور دینی مقاصد کے خلاف ہے بالخصوص اگر شریعت کی تعبیر کا اختیار نامزد افراد کو دے دیا جائے تو دین اور شریعت ان کی سوچ کے تابع بن کر رہ جاتے ہیں ایسے نامزد اداروں کی سوچ و فکر میں سوائے چند نامزد افراد کے قوم بحیثیت مجموعی شریک نہیں ہو سکتی جیسے وہ پارلیمنٹ کے "بلوں" کی بحثوں میں شریک ہوتی ہے یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کے خود ساختہ نمائندے تصور کرنے لگ جاتے ہیں اسی کا نام تھیوکریسی ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اس پس منظر میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا اجتہاد مبنی بر صحت معلوم ہوتا ہے جس میں انہوں نے قوم کی منتخب پارلیمنٹ پر نامزد مذہبی مشاورتی کونسل کی بالادستی کی مخالفت کی ہے اسی طرح اگر علامہ اقبال" آج زندہ ہوتے تو وہ یقیناً پارلیمنٹ پر وفاقی شرعی عدالت کی بالادستی کی بھی مخالفت کرتے کیونکہ یہ بھی نامزد ادارہ ہے"۔

لہٰذا علامہ اقبال کی تعلیمات کے پیش نظر وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار نہیں دیا جانا چاہیئے کہ وہ کسی قانون کے متعلق فیصلہ دے کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ اختیار قوم کی نمائندہ پارلیمنٹ کو حاصل ہے یا کسی خاص مسئلے پر ایسا اختیار سپریم کورٹ کو دیا جا سکتا ہے جو ایک باقاعدہ عدالت ہے جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کی تشریح کرتی ہے۔ قوم کے نمائندہ ادارے کو خود مختار رہنا چاہیئے اس پر کسی نامزد ادارے کی بالادستی درست نہیں۔

یہ کچھ تحریر کرنے کے بعد جناب یوسف گورایہ صاحب اسی مضمون میں رقمطراز ہیں کہ:

"جب تعبیر شریعت کا اختیار قوم کی منتخب پارلیمنٹ کے سپرد ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں صرف ارکان پارلیمنٹ غور و فکر کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان پارلیمنٹ قوم کو درپیش مسائل قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرتے ہیں کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے غور و فکر اور عقل و تدبر سے کام لیتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے باہر پوری قوم اپنے نمائندوں کی بحثوں اور جہتوں کو دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ اپنے علم اور تجربے سے نمائندوں کی مدد کرتی ہے ہر طبقے کے فقہاء، علماء، اساتذہ، وکلاء، قضاۃ، حکام، عمال اور اہل علم و دانش اپنی تحقیق کے ساتھ اس عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ منتخب نمائندوں اور قوم کی مجموعی فکر ایک خاص اسلوب میں ڈھل کر قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس پورے عمل کا نام پارلیمنٹ کا اختیار تعبیر شریعت ہے اگر خدانخواستہ پوری قوم اپنے منتخب نمائندوں اور خود اپنی مجموعی

اجتہادی صلاحیت سمیت گمراہ رہتی ہے تو ایسی قوم کے وجود کا سرے سے کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔"

آپ مندرجہ بالا حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں عام انتخابات کے سلسلہ میں "اسلامی جمہوری اتحاد" کی طرف سے اخبارات میں جو منشور شائع ہوا اس کی صرف ایک شق ملاحظہ فرمائیں کہ

وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے گی ، اس وسعت پذیری سے کس قسم کا نظام معرض وجود میں آئے گا اس کا اندازہ ہر کوئی اپنی اپنی دانست کے مطابق لگا سکتا ہے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور - مورخہ ۸۸ - ۱۱ - ۱۵

فقہ اسلامی کی تشکیل جدید پر علامہ کا اجتہاد

بہرحال فقہ کی تشکیل جدید کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے شدید احساس نے علامہ اقبال کو پریشان کر رکھا تھا اگر قارئین کو علامہ اقبال کی اس فکرمندی کا کچھ اندازہ کرنا مقصود ہو تو ہماری التماس ہے کہ وہ جناب گورایہ صاحب کے مضمون پاکستان ، اقبال اور اجتہاد کا مندرجہ ذیل اقتباس کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

فقہ کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں اقبال کا قلب حساس

"آخری عمر میں علامہ اقبال" فقہ کی تشکیل جدید کے شدید احساس میں مبتلا تھے۔ وہ اسلام کی نئی فقہ مرتب کرنے کے شدید طور پر آرزو مند تھے۔ انہوں نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" بزبان انگریزی میں جو کتاب لکھی تھی اس میں دور جدید میں اجتہاد کے اصول بیان کر دیئے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں مکمل ہو گئی تھی اس کے دو سال بعد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ایک جدید اسلامی ریاست ..... پاکستان کے قیام پر مبنی اجتہاد پیش کیا۔ ان کا یہ اجتہاد اتنا مقبول ہوا کہ برصغیر کے مسلمان اسے عملی شکل دینے کے لئے بے تاب و بے قرار ہو گئے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کو یقین ہو گیا کہ پاکستان معرض وجود میں آکر رہے گا۔ اس یقین نے انہیں مزید بے چین کر دیا۔ انہیں احساس تھا کہ جب پاکستان بن جائے گا تو اسے نئی فقہ کی ضرورت ہو گی۔ نئی فقہ نئے اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ نیا اجتہاد، اجتہاد کے باعث نئے اصول چاہتا ہے قدیم فقہ اور اس کے اصول فقہ نئے اجتہاد کے لئے کارآمد نہیں رہے تھے۔ انہی احساسات کے انہوں نے نئے اجتہاد پر مبنی نئی فقہ مرتب کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے چونکہ اس وقت اسلامی ریاست قائم نہ تھی اور نہ ہی اسلامی پارلیمنٹ موجود تھی۔

علامہ اقبال کا تیار کردہ اجتہادی منصوبہ

اس لئے انہوں نے آئندہ قائم ہونے والی جدید اسلامی ریاست میں کئے جانے والے اجتہاد کے رہنما اصول وضع

کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ انہوں نے اس منصوبے کا خاکہ خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا جو انہوں نے جناب میاں محمد شفیع (م۔ش) کے سپرد کیا تاکہ اس کی تفصیلات انہیں املا کروا سکیں۔ علامہ اقبال کا یہ اجتہادی منصوبہ جناب بی اے ڈار کی محنت اور کوشش سے اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL میں چھپ چکا ہے اس کی تفصیل جناب میاں محمد شفیع کی انگریزی تحریر کے اردو ترجمے کی صورت میں پڑھیئے وہ لکھتے ہیں "۱۹۳۷ء میں مجھے علامہ اقبال کے منشی کی حیثیت سے کام کرنے کی سعادت حاصل تھی، انہوں نے مجھے کچھ کاغذات مرحمت فرمائے جو خود ان کے قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ یہ اس منصوبے کا خاکہ تھا جس پر وہ ایک کتاب "مقدمہ مطالعہ اسلام بحوالہ خصوصی فقہ اسلامی" کے نام سے لکھنا چاہتے تھے چونکہ ان کی بینائی دن بدن کمزور ہو رہی تھی اس لئے ان کا ارادہ یہ تھا کہ اپنی زیر نظر کتاب کو مجھے املا کرا دیں۔ یہ انگریزی کتاب اسلامی سیاست اور اسلامی فقہ کے متعلق ایک عہد ساز اور مستند کتاب ہوتی لیکن افسوس کہ ان کی صحت اس تیزی سے خراب ہوتی گئی کہ وہ اپنے اس منصوبے کو مکمل نہ کر سکے حتیٰ کہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کی شمع حیات بجھ گئی۔ یہ منصوبہ ابتداءً والی بھوپال نے حضرت علامہ کے سپرد کیا تھا اس وقت سے علامہ کے نوٹس پر مبنی یہ منصوبہ میرے پاس قومی امانت کے طور پر تھا۔ ایک دفعہ یہ منصوبہ قائداعظم کے علم میں آیا انہوں نے ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء کو مجھے لکھا کہ "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید THE RECONSTRUCTION OF ISLAMIC JURISPRUDENCE کے متعلق اقبال" جو کتاب لکھنا چاہتے تھے میں اس کے متعلق ان کے منصوبے کے نوٹس دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے بعد میں اس پر غور کر سکوں کہ کون سی قابل شخصیت ایسی ہے جو اس کام کی تکمیل کر سکے گی۔ چونکہ موضوع کا تعلق فقہ اسلامی سے ہے اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی قانون دان اس کا حق ادا کر سکے گا۔" چونکہ حضرت علامہ کا یہ منصوبہ پنسل سے لکھے ہوئے نوٹس پر مشتمل تھا اس لئے مرور زمانہ سے ان کے نقوش مدہم پڑتے چلے جا رہے تھے ۱۹۴۷ء میں جب میں سنٹرل جیل ملتان میں نظر بند تھا تو میں نے ان کے نوٹس کو اپنے قلم سے الگ لکھا تھا۔ اب میں یہ نوٹس بغیر کسی رد و بدل کے قوم کے سپرد کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ جو حضرات اس کی استعداد رکھتے ہوں وہ حکیم الامت کی منشا کے مطابق ایک ایسی کتاب تصنیف کر سکیں جو ہماری حیات ملی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہو۔" اجتہاد کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کی مجوزہ کتاب پر جناب میاں محمد شفیع کی تعارفی تمہید یہاں ختم ہوتی ہے اس کے بعد پوری کتاب کا مفصل اور جامع خاکہ درج کیا گیا ہے یہ پوری کتاب اہم ترین ملی سرمایہ ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اگر علامہ اقبالؒ کے وضع کردہ خطوط پر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو آج پاکستان کی بہت سی دستوری، قانونی، فقہی اور عدالتی مشکلات آسان ہو جاتیں۔ اس کتاب کے خاکہ مضامین میں تین باتیں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اوّل اسلام کیا ہے؟ اس سے شریعت کی تعریف متعین ہوتی ہے۔ دوم ابتداء میں رومی اور ایرانی تہذیبوں نے اور بعد میں دوسری تہذیبوں نے اسلام پر کیا اثرات مرتب کئے۔ مسلمانوں نے رومی اور ایرانی سلطنتوں کو تو تباہ کیا مگر خود ایک عرب سلطنت قائم کر لی۔

اس طرح ملوکیت کے زیر اثر جو اسلامی فقہ معرض وجود میں آئی وہ اصل اسلام سے مختلف اور اس پر اضافے کی تہہ ہے جسے ہٹائے بغیر اصل اسلام سامنے نہیں آسکتا۔ سوم داخلی اور خارجی اثرات کی تہہ سے اسلام کو نجات دلانے کے لئے منہاجِ تحقیق اور اصولِ اجتہاد و استنباط کا طریق کار بیان کیا گیا۔

میں نے محترم میاں محمد شفیع صاحب سے علامہ اقبالؒ کی کتاب پر تفصیلی گفتگو کی۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہ بقید حیات اور خوب چاک و چوبند ہیں۔ انہوں نے فقہ اسلامی کی تشکیل جدید" پر جو مزید معلومات فراہم کیں وہ انتہائی بصیرت افروز ہیں۔ ان کی بنیاد پر اس نظریئے کو کلی طور پر تقویت پہنچتی ہے کہ علامہ اقبالؒ اجتہاد کے لئے نئی فقہ مرتب کرنے پر پوری مستعدی سے عمل پیرا تھے۔ علامہ اقبال کی نثری اور شعری تعلیمات کی روشنی میں اس خاکے کی تکمیل ممکن ہے کیونکہ بنیادی بات اصول و قواعد فقہ کی ترتیب اور توضیح ہوتی ہے۔ ایک مجتہد جب اپنے اجتہاد کے اصول اور استنباط کے قواعد و ضوابط بیان کر دے تو اس کا اساسی اور اصولی کارنامہ مکمل ہو جاتا ہے۔ علامہؒ نے اصول و قواعد کی حد تک اپنی مطبوعہ کتاب اور زیر نظر کتاب میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ ان اصولوں کی رہنمائی میں ایک مفصل اور جامع کام مکمل کر لینا مشکل نہیں۔

فقہ کی تشکیل جدید کے متعلق قائداعظم کی خواہش

ان اصولوں کی رہنمائی میں ایک مفصل اور جامع کام مکمل کر لینا مشکل نہیں اسی لئے قائداعظم نے علامہ کی کتاب "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید" کے اصولوں پر مبنی خاکہ طلب کر کے اسے مکمل کروانے کا ارادہ کیا تھا مگر تحریک پاکستان کی بے پناہ مصروفیت کے سبب وہ اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ قیام پاکستان کے بعد علامہؒ کے اجتہادات کے مطابق دستور سازی اور قانون سازی کا کام انجام پانا تھا مگر قائداعظم کی جلد وفات کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ اب فوری طور پر اسے مکمل کیا جانا چاہیئے۔

تعبیرِ شریعت کا اختیار اسمبلی کو کیوں؟

پاکستان کی مشہور اور علمی شخصیت جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ سابق ڈائریکٹر محکمہ اوقاف نے اپنے ایک فکر انگیز مضمون "جدید اسلامی ریاست میں تعبیرِ شریعت کا اختیار" کے عنوان سے علامہؒ کے حوالہ سے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ تعبیرِ شریعت کا اختیار اسمبلی کو کیوں؟ چنانچہ جناب گورایہ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا جواب یہ ہے:

"اب وقت آگیا ہے کہ فقہی ملکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیار اجتہاد لے کر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ اور قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرقے دورِ ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں۔ اب جمہوریت کا دور ہے۔ چوتھے خلیفہ راشد کی وفات کے بعد عہد بنو امیہ اور بعد میں بنو عباس میں تعبیرِ شریعت کا اختیار امت سے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تعبیرِ شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے۔ جو اس کی اصل اور جائز حقدار ہے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اس کا

استعمال کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ متحارب فرقوں کی موجودگی میں عہدِ جدید میں یہی واحد شکل ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی طریقے سے قانون سازی میں عوام کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے کیونکہ عوام ریاست و معاشرت کے معاملات میں گہری بصیرت کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی شرکت کے بغیر قانون سازی بے جان اور بے نتیجہ رہتی ہے۔"[1]

اس اقتباس کے بعد جناب وارث میر صاحب علامہ اقبال کی اس مومنانہ فراست کو بیان کرنے کے بعد اپنے مضمون کو جن الفاظ میں ختم کرتے ہیں امتِ واحدہ کی تشکیل کی خاطر اُن پر ہم سب کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور وہ یہ کہ :

"کاش نظریاتی کونسل یا شریعت بل کے مجوزین کی طرف سے اس قسم کی تجویز بھی پیش کی جاتی کہ پاکستان میں دینی اور دنیوی تعلیم کی ثنویت ختم کر کے یکساں نظامِ تعلیم رائج کر دیا جائے تاکہ ہماری درسگاہوں سے ایسے "علماء" بھی پیدا ہونے لگیں جو دینی حکمتوں کا علم رکھنے کے ساتھ جدید سائنٹفک ذہن بھی رکھتے ہوں۔ اور جو قوم کی تخلیقی و اجتہادی قوتوں کے لیے واقعی مہمیز ثابت ہوں اور ہماری فکری اور عملی زندگی میں تضادات کو ہوا دینے کی بجائے تضادات کو ختم کرنے کا باعث ثابت ہوں۔" **فرمودۂ اقبالؒ**

"تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہوا ہے اور ہم بوڑھوں کے لیے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ پھر نئی آرزوؤں اور نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔"

کس قدر خوب ہیں یہ الفاظ ملک کے مشہور شاعر جناب احمد فراز صاحب کے کہ "انسان اُجڑے شہر بسا سکتا ہے (لیکن) تباہ حال نسل سنوارنا مشکل ہے۔" اور یہ مشکل کام صرف اور صرف کتاب اللہ کی راہنمائی سے ہی آسان ہو سکتا ہے فقہوں کے نفاذ سے نہیں۔

مقامِ فقہ کی اس داستان کے بعد اب ہمیں مقامِ حدیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا تاکہ دیکھ لیا جائے کہ ہم اس میدان میں کہاں کھڑے ہیں۔"

---

[1] بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۸۶ء۔

تیسرا باب

کتاب و سُنّت

فقہ کے تذکرہ کے بعد اب اگر ہم سُنّت کی وادی میں قدم رکھیں تو یہاں بھی ہمیں ہر فرقہ اسی قدر اختلافات میں مبتلا دکھائی دیتا ہے جس قدر فقہ اور حدیث میں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب و سنّت کے الفاظ جس عقیدت مندی کے ساتھ ہمارے ہاں زبان زدِ عام ہیں شاید ہی کوئی دوسرا لفظ تواتر کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہو۔

ملکی قانون

آپ کو ہر محراب و منبر سے یہی آواز سُنائی دے گی کہ پاکستان کا قانون کتاب و سنّت کے مطابق بنایا جائے گا۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دونوں آئینوں میں یہ شق موجود ہے کہ ملک کا قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا اور اس کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور ۱۹۷۳ء کی شق (آرٹیکل) (۱) ۲۲۷ میں بھی کہا گیا ہے کہ :

"تمام موجودہ قوانین کو اِن اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن و سنّت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اِن احکام کے خلاف ہو۔"

مختلف منشوروں میں کتاب و سنّت کا ذکر

علاوہ ازیں ۱۹۶۹ء کے انتخابات کے سلسلہ میں سیاسی جماعتوں کے منشوروں کو اگر دیکھا جائے تو کالعدم جماعتِ اسلامی اور کل پاکستان جمعیتہ علمائے اسلام کے اسلامی منشور میں بھی یہی الفاظ نظر آئیں گے کہ قرآن سنّت کو بہ الفاظ صریح قانون کا ماخذ اوّل تسلیم کیا جائے بلکہ ۳۱ علماء کے بائیس نکات (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) میں تو بار بار قانونی حیثیت سے کتاب و سنّت کے الفاظ کو پیش کیا گیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس چیز کو قانون کا ماخذ قرار پانا ہو وہ تحریر متفق علیہ شکل میں موجود ہونی چاہیئے۔ لیکن اِس قدر تکرار اور اہمیت کے بیان کرنے کے باوجود حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے (یعنی قرآن) وہ تو ہر فرقہ کے لیے پوری ملّت اسلامیہ کے پاس تحریری طور پر

دنیا کے کونے کونے میں بغیر کسی ردّ و بدل کے محفوظ اور مکمل شکل میں متفق علیہ حیثیت سے موجود ہے لیکن جہاں تک سنّت کا تعلق ہے وہ پورے کرۂ ارض پر کہیں بھی ان خصوصیات کے ساتھ بغیر کسی ردّ و بدل کے محفوظ، مکمل اور متفق علیہ کتابی شکل میں موجود نہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف بالآخر مودودی صاحب (مرحوم) کو بھی کرنا پڑا کہ:

مودودی صاحب کا اعتراف

"کتاب و سنّت کی کوئی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے نزدیک متفق علیہ ہو۔" (بحوالہ ایشیا۔ مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

اس اعتراف کے باوجود

لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس حقیقت کو سمجھنے، سوچنے اور اعتراف کرتے ہوئے بھی خود مودودی صاحب تادمِ زندگی اور ان کی پوری جماعت کے علاوہ ہر کس و ناکس کا حرفِ زباں یہی ٹھہرا اور ٹھہرا چلا آرہا ہے کہ ہم اپنے قانون کی بنیاد کتاب و سنّت پر رکھیں گے۔ جبکہ متفق علیہ کتابی شکل میں سنّت کا کوئی مجموعہ تک ہمارے پاس نہیں۔

صدارتی حکم

یہی وجہ تھی کہ اس سلسلہ میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے دستور ۱۹۷۳ء جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کے اس آرٹیکل کی ترمیم و وضاحت صدارتی حکم ۱۹۸۰ء / ۱۴ مجریہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کی رُو سے ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "جب ان قوانین کا اطلاق (یعنی زکوٰۃ اور عشر وغیرہ) مسلمانوں کے کسی فرقہ پر سنل لاز (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن و سنّت سے مراد اس فرقہ کی تعبیر ہوگی۔"

ایک اہم سوال نامہ

آج سے ۲۷ سال پیشتر فروری ۱۹۵۶ء میں ادارہ طلوعِ اسلام نے ماہرین قانون کی توجہ ایک "سوالنامہ" کی شکل میں مندرجہ ذیل امور کی طرف دلائی تھی۔ یہ سوالات کس حد تک قابلِ غور ہیں، اس کا اندازہ ہمیں خود کرنا ہوگا۔ لیکن یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تاوقت کہ آئینی طور پر یہ فیصلہ نہ کر لیا جائے کہ متفق علیہ شکل میں اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا معیار کیا ہے اس وقت تک نہ تو افکار تازہ پیدا ہوں گے اور نہ ہی ملّتِ اسلامیہ ان مسائل کے گرداب سے نکل سکے گی جنہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر

رکھا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم کفر کے فتوؤں سے گریز کرتے ہوئے بڑے ٹھنڈے دل سے، جذباتیت کے بغیر، خالص فکری انداز میں فرقہ بندی کے تصورات کے گرد و غبار سے پرفشاں ہو کر تلاشِ حقیقت کی جستجو کی غرض کے لیے تعمیرِ ملت کی خاطر ان سوالات کا جواب تلاش کریں۔ کیونکہ اگر ہم نے متعین طور پر ان سوالات کا جواب پالیا ـــــ تو ہم ایک بار پھر عہدِ رفتہ کو آواز دینے کے قابل ہو جائیں گے وگرنہ خاکِ بدہن، ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ کیونکہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جس قوم میں غور و فکر کی صلاحیت مفقود ہو جائے تو خدا اس کی جگہ دوسری قوم کو لے آتا ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔ فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے تب کسی قوم کی شوکت پر زوال آتا ہے۔

لہٰذا پہلا سوال یہ ہے کہ:

۱۔ سنّتِ رسولؐ سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کیا حدیث اور سنّت میں کوئی فرق ہے اگر فرق ہے تو کیا؟

۳۔ کیا رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں تھیں ایک ذاتی حیثیت اور دوسری رسالت کی یا آپؐ نے ساری عمر جو کچھ کیا یا کہا وہ رسول اللہؐ کی ہی حیثیت سے تھا؟

۴۔ اگر رسول اللہؐ کی ذات اور رسالت کی حیثیتیں الگ الگ تھیں تو کیا سنّت میں صرف وہ باتیں شامل ہوں گی جو آپؐ نے بحیثیتِ رسولؐ کیں یا وہ بھی جو اپنی ذاتی حیثیت سے کیں، مثلاً رہنے سہنے کا طریق، کھانے پینے اور وضع قطع کا انداز وغیرہ۔

۵۔ اگر سنّت میں صرف وہی امور شامل ہیں جو حضورؐ نے بحیثیتِ رسول کیے تھے تو کیا یہ تفریق کہیں پہلے سے موجود ہے کہ آپؐ نے فلاں بات بحیثیتِ رسولؐ کی تھی اور فلاں بات ذاتی حیثیت سے۔

۶۔ اگر سوال نمبر ۵ کا جواب نفی میں ہے تو اب اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپؐ نے کون سی بات بحیثیتِ رسولؐ کی تھی اور کون سی ذاتی حیثیت میں؟

۷۔ جن امور کو آپ رسول اللہؐ کی سنّت قرار دیتے ہیں:

(الف) وہ کس کتاب میں درج ہیں؟

(ب) کیا اس کتاب کو خود رسولِ خدا یا آپؐ کے خلفائے راشدین میں سے کسی نے مرتّب کیا تھا؟

(ج) اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس کتاب کو کس نے مرتّب کیا اور کب؟

(د) کیا اس کتاب میں جو کچھ درج ہے وہ ایسا ہے کہ اسے آیاتِ قرآنی کی طرح) من و عن تسلیم کر لیا جائے یا اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن پر تنقید کی جا سکتی ہے؟

(و) تنقید کرنے کا حق کسے حاصل ہوگا؟

۸- پیرہ (۷- الف) میں جس کتاب کا نام آپ نے لکھا ہے کیا اسے مسلمانوں کے سب فرقے تسلیم کرتے ہیں۔ یا ایسے فرقے بھی ہیں جن کے نزدیک وہ مستند قرار نہیں پاتی ؟

۹- جن امور کو آپ سنّت رسول اللہؐ سمجھتے ہیں کیا ان میں ایسے امور بھی ہیں جنہیں اور لوگ جو سنّت رسول اللہؐ کے قائل ہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے ؟

۱۰- اگر پیرہ ۹ کا جواب اثبات میں ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپ دونوں میں سے کس کی بات صحیح ہے ؟

۱۱- جس بات کو آپ سنّت رسول اللہ سمجھتے ہیں اگر کوئی شخص اس کے خلاف کسی بات کو سنّت رسول اللہ سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو تو آپ کے نزدیک وہ شخص متبع سنّت ہوگا یا نہیں ؟- اور آخر پر یہ کہ

۱۲- جس بات کو آپ سنّت رسول اللہ سمجھتے ہیں کیا آپ کے نزدیک کسی کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے اس کا حق حاصل ہے کہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکے ؟"

اور اس کے بعد یہی بازگشت ایک دوسری نوعیت کے ساتھ اسی ادارہ کی طرف سے مئی ۱۹۸۱ء کو مندرجہ ذیل سوالات کی شکل میں بلند ہوئی اور وہ یہ کہ :

۱- آئین پاکستان کی رو سے مملکت میں کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو قرآن و سنّت کے خلاف ہو۔

۲- وفاقی شرعی عدالت کا فریضہ ہے کہ جو قانون قرآن و سنّت کے خلاف ہو اسے کالعدم قرار دے دیا جائے۔

۳- سوال غور طلب یہ ہے کہ اگر کسی قانون کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے تو کیا اس کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت باقی رہے گی کہ وہ سنّت کے بھی خلاف ہے یا نہیں (اس کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ کسی چیز کا قرآن کے خلاف ہونا خلاف اسلام ہوتا ہے۔ مثلاً رجم کی سزا، وراثت کے سلسلہ میں وصیت وغیرہ اور زکوٰۃ اور عشر کا نفاذ)

۴- اگر کوئی قانون قرآن کے خلاف ہو اور سنّت کے مطابق تو اس کی کیا پوزیشن ہوگی ؟ کیا وہ اسلام کے مطابق تصور کیا جائے گا یا اس کے خلاف۔

۵- آئین پاکستان کی ایک ترمیم کی رُو سے ہر فرقہ اس کا مجاز ہے کہ پرسنل لاز کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کے مطابق کرے۔ کیا مذہبی فرقوں کی ایسی فہرست دی گئی ہے جسے اس مقصد کے لیے قانون تسلیم کرتا ہو اگر نہیں تو پھر یہ کیسے طے ہوگا کہ یہ فرقہ کون سا ہے اور اس کی فقہ کون سی ؟

یہ ہے کتاب و سنّت کی متفقہ تعبیر کی حقیقت اور اس کے نفاذ کی راہ میں حائل مشکلات، جن پر غور و فکر کرنا ہر شخص کا فرض قرار پاتا ہے۔

چوتھا باب

مقامِ احادیث

احادیث کس طرح جمع ہوئیں؟

فقہ اور کتاب و سنّت کے تذکرہ کے بعد جہاں تک احادیث کا تعلّق ہے، اگر پہلا معاملہ نازک تھا، تو یہ نازک تر دکھائی دے گا۔ جب کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے انسان کا خالی الذہن ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

ہمارے ہاں جامعین احادیث میں سے امام بخاری اور امام مسلم کا نام زیادہ معتبر تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے بتدریج ۶ لاکھ اور ۴ لاکھ احادیث جمع کیں اور پھر امام بخاری رضؒ نے ۶ لاکھ احادیث میں سے (مکرّرات نکال کر) صرف ۲۷۶۲ روایات کو اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ جب کہ امام مسلم نے چار لاکھ احادیث میں سے ۴۳۴۸ کو صحیح قرار دیتے ہوئے مسلم شریف میں جگہ دی۔ علاوہ ازیں امام ابوداؤد نے ۵ لاکھ میں سے ۴۸۰۰۔ امام ترمذی نے ۳ لاکھ میں سے ۳۱۱۵۔ امام ابنِ ماجہ نے ۴ لاکھ میں سے ۴۰۰۰ اور امام نسائی نے دو لاکھ میں سے ۴۳۲۱۔ احادیث کو معتبر قرار دے کر اپنے مجموعوں میں درج کیا ہے۔

اہلِ حدیث کا نظریہ

ان تمام مجموعوں میں سے بخاری اور مسلم کی احادیث کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی صحت پر اُمّت متفق ہے۔ نیز ان احادیث کی صحت قطعی ہے اور ان کا انکار کفر اور ملّت سے خروج کے مترادف ہے۔ (ملاحظہ ہو، جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ ۴۸۔ ۵۵ شائع کردہ صدر جمعیت اہلِ حدیث مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) لیکن اس سلسلہ میں مرحوم مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ:

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین (بحوالہ رسائل و مسائل حصّہ اوّل ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۲۹)

اور دوسری جگہ فرمایا "قولِ رسول اور روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے نزول من اللہ ہونے میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں بہ خلاف اس کے کہ روایات میں شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں" (رسائل و مسائل حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۹)
ایک اور جگہ فرمایا "یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔" (بحوالہ ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

کفر کا فتویٰ

مودودی صاحب (مرحوم) کے ان خیالات کی بنا پر "جمعیت علمائے اسلام پاکستان" کے سابق صدر اور دارالعلوم ٹنڈو الہ یار کے سابق شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم) نے اپنے ایک فتویٰ مورخہ ۲۱ رجب ۱۳۷۲ھ میں تحریر کیا "یہ شخص (یعنی مودودی صاحب) منکر حدیث ہے گمراہ ہے اور مبتدع ہے۔ جاہل اجہل ہے، پاگل ہے۔" (بحوالہ مقام حدیث جلد دوم صفحہ ۴۱۰)

ہم نے یہاں شیعہ حضرات کے مجموعہ احادیث کا ذکر نہیں کیا ان حضرات کی حدیثوں کے مجموعے اپنی فقہ کی طرح بالکل الگ ہیں جو دوسرے اہل فقہ کو قابل قبول نہیں۔ بہر حال جہاں تک بخاری شریف اور مسلم شریف وغیرہ کے مجموعوں کا تعلق ہے یہ ۲۰۰ سال بعد بغیر کسی تحریری ریکارڈ کے مرتب ہوئے۔ ان حدیثوں کے مجموعوں میں جہاں کئی حدیثیں قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں وہاں بے شمار ایسی بھی ہیں جو رسول اللہ کی شان کے شایان ہی نہیں اس سلسلہ میں بخاری شریف کا صرف باب حیض اور باب غسل ملاحظہ کیا جا سکتا ہے

اس کے بعد یہ کہ ان ذخیروں میں سے فرقہ وارانہ اعتقادات کے مطابق اپنے اپنے مجموعے مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں رسولِ خدا کی ذات جن کے قول و فعل میں کوئی تضاد تک نہ تھا، کہیں وہ بریلویوں کے گروہ میں کھڑی دکھائی دی تو کہیں شافعیوں کے گروہ میں۔ کہیں دیوبندیوں کے گروہ میں اور کہیں نقشبندیوں کے گروہ میں۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۱۴۸۔ علامہ پرویز صاحب کی تصنیف کا مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو نہایت غور طلب ہے۔

"سُنّیوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے فرقوں کی احادیث کے مجموعے الگ الگ نہیں لیکن حقیقت یہ نہیں۔ ان کی قابل اعتماد احادیث (ان کے اپنے خیال کے مطابق) بھی الگ الگ ہیں اور یہی الگ الگ حدیثیں ہمارے ہاں الگ الگ فرقوں کی بنیاد ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعے پر غور فرمایئے۔ مشکوٰۃ المصابیح احادیث کا قابلِ اعتماد مجموعہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس میں سُنّیوں کی معتبر ترین مجموعہ کی منتخب احادیث درج ہیں۔ کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے کہ احادیث کا ایک مجموعہ (زجاجۃ المصابیح) کے نام سے شائع ہوا تو اس پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی (مدیر "صدق جدید" لکھنؤ) نے حسب ذیل تبصرہ کیا۔

حنفی حدیثیں

"محمد بن عبداللہ الخطیب کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبوی کا یہ مستند کارآمد نور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے اور عوام و خواص سب کے لیے شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے لیکن صاحب مشکوٰۃ باوجود اپنی جلالۃ القدر بہرحال حنفی المذہب نہ تھے شافعی مذہب تھے۔ اس لیے شافعی مذہب کی رعایت کا ان کی کتابوں میں جا بجا آجانا قدرتی تھا۔ جس میں رعایت ان کے مسلک و مشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدرآبادی فاضل کے حصے میں آئی ہے۔" (بحوالہ "صدقِ جدید لکھنؤ ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء بحوالہ مقام حدیث)

اسی سلسلہ میں ایک اور مثال — شافعی اور حنفی تو اہلِ فقہ کے دو فرقے ہیں۔ اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ میں کس قدر بُعد ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ مولانا مفتی محمد حسن (مرحوم) مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے خلیفہ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی تھے۔ مولانا محمد اجمل خان نے ان کا حسب ذیل واقعہ ہفتہ وار اخبار "خدام الدین" لاہور کی ۱۴ جون ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا "حدیث کسی حنفی سے پڑھو"

"حضرت مفتی صاحب نے اپنے قیام (امرتسر کے دوران) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی (نوراللہ مرقدہٗ) سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ تم نے احادیثِ مبارکہ اہلِ حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں اور میں حنفی ہوں، جوڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں پھر درخواست بیعت کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے تیس سال دیوبند میں تعلیم میں صرف کیے اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا۔"

(بحوالہ "مطالب الفرقان" جلد چہارم صفحہ ۱۴۹)

قرآن کا حنفی ترجمہ

ہم نے دین کی یہ خدمت صرف احادیث کی صورت میں ہی نہیں کی بلکہ اپنے مخصوص نظریات کے بُتوں کی پُوجا کے لیے قرآن حکیم کے تراجم اور تفاسیر بھی اس نہج پر مرتب کیں۔ تاکہ ہمارے اپنے نفس کی تسکین ہو سکے۔ مثلاً کچھ عرصہ پیشتر جب تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز مدرس سید

انظر شاہ صاحب نے اس کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا :

" صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختۂ مشق ہے یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے کوئی بُری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو خوش آئند ہے۔ جس جماعت کی طرف سے ہو قابل پذیرائی ہے۔ مگر افسوس علم جیسے لازوال ابدیت نشان سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہرحال جو کچھ ہُوا ہو چکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خالص حنفی نقطۂ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔"

(بحوالہ پارہ اوّل۔ جلد اوّل صفحہ ۴ مطالب الفرقان صفحہ ۱۴۹)

فرقہ اہلسنّت والجماعت کے لیے تفسیر

اس قسم کا افتتاحیہ دہلی کے ماہنامہ " برہان " میں مئی ۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے قرآن حکیم کے انگریزی زبان میں ترجمہ اور تفسیر شائع ہونے پر سپردِ قلم کیا تھا کہ :

" انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمے کی ضرورت تھی جس کو اہلِ سنّت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحت عقیدہ و خیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کام کیا گیا ہو۔ الحمدللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔"

بہرحال ان گروہ بندانہ نظریات کے تحت قرآن حکیم کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کو ہم نے چیستان بنا رکھا ہے ورنہ اقبال کے الفاظ میں ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے !

قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ " جو قرآن میں نہیں اسے شریعت بنا دینے والے خدا کے شریک ہیں " ۴۲/۲۱ قبل اس کے کہ کتاب و سنّت کی اصطلاح کی طرف آئیں ان متضاد تراجم و تفاسیر، مختلف فقہوں اور وضعی روایات نے ہمارے درمیان کس قدر الجھاؤ پیدا کر رکھا ہے اس کی ایک اور محسوس مثال کا پیش کرنا زیادہ

مناسب ہو گا تاکہ حقیقت مزید نکھر کر سامنے آجائے۔

رجم کی سزا

ہمارے ہاں جُرم زنا کے سلسلہ میں اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اس جرم کا ارتکاب کرے تو انہیں سنگسار کر دیا جائے اور اس کے برعکس اگر غیر شادی شدہ مرد اور غیر شادی شدہ عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں لیکن اس سلسلہ میں جہاں تک قرآن حکیم کی سورۃ نُور کی آیت دو کا تعلق ہے، وہاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تخصیص کیے بغیر ہر ایک کے لیے ۱۰۰، ۱۰۰ کوڑوں کی سزا ہی متعین کی گئی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ کچھ کہنے والوں کے خلاف ایک شور برپا کر دیا جاتا ہے اور جب ان حضرات سے پوچھا جائے کہ آخر سنگساری کی یہ سزا آئی کہاں سے۔ اور دوسرا یہ کہ قرآنی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی کے جرم کی سزا اس کی علمی سطح اور اس کی تربیت کے مطابق ہونی چاہیئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوڑوں کی شکل میں تو کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن سنگساری کی بنا پر اس میں کمی کی کیا صورت ہو گی؟ سو بجائے اس کے کہ ہم قرآن کے بیان کردہ ۱۰۰ کوڑوں والے اصول کو تسلیم کریں، وضعی روایات اور خود ساختہ فقہوں کو ہمارے درمیان حائل کر دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں بخاری کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔ کہ:

"حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی تھے) کہ زمانہ جاہلیت میں میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔" (بحوالہ صحیح بخاری۔ ایام الجاہلیہ)

اور اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجر رح عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

"حضرت عمرو بن میمونؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لیے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اُٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے) چنانچہ اس نے

بندر یا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کردی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہوگئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر اِدھر اُدھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا۔" (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے)۔ (فتح الباری۔ شرح بخاری۔ جلد ہفتم۔ صـ۱۲۱)

اور تفسیر کبیر امام رازی جلد نمبر ۳۲ صفحہ ۱۳۴ کے مطابق رجم کی آیت رسولِ خدا کے ہاں کی پالتو بکری کی نظر ہوگئی جب حضرت عائشہ نبی اکرمؐ کی وفات کے سلسلہ میں تجہیز و تکفین میں مشغول تھیں۔ یعنی اب حالت یہ ہے کہ وہ آیت تو موجود نہیں لیکن عمل اس کے مطابق کروایا جاتا ہے۔

سنگساری کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ کا اداریہ

تصریحات کے بیان کرنے کے بعد اب قارئین کی خدمت میں روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۴ مئی ۱۹۸۹ء کا ایک اداریہ جو بدکاری کے ایک جرم پر ایک عدالت کی طرف سے سنگساری کا حکم صادر ہونے پر لکھا گیا تھا پیش خدمت ہے جناب مدیر لکھتے ہیں۔

بدکاری کے جرم میں سنگساری کا حکم

"بدکاری ایک ایسا مکروہ ترین معاشرتی جرم ہے جس کے تباہ کن اثرات کئی نسلوں اور خاندانوں تک کو متاثر کرتے ہیں اس قبیح جرم کی اس سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اسلام میں اس کی سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے اور جن ممالک میں یہ اسلامی سزائیں نافذ ہیں وہاں ایسے جرائم کی تعداد انتہائی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے وطن عزیز میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا غلغلہ تو ایک عرصے سے سننے میں آرہا ہے لیکن عملی طور پر اس کے نفاذ کی سمت میں بہت کم پیش رفت ہوئی ہے لیکن گاہے گاہے اس جانب قدم بڑھانے کی کوئی نہ کوئی جھلک ضرور نظر آتی ہے ایک اطلاع کے مطابق مہر محمد نواز خاں ڈسٹرکٹ سیشن جج بہاولنگر نے اگلے روز چک ۷۹ فور آر کے ایک شریعت کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے ایک شادی شدہ مرد اور عورت کو بدکاری کے جرم میں سنگساری کی سزا کا حکم سنایا ہے، اسلام میں حدود کے قیام کے سلسلہ میں یہ ہدایت ہے کہ شبہات کا تا حد امکان فائدہ دے کر اس سے ملزم کو بچانا چاہیئے لیکن اگر جرم ثابت ہو جائے تو پھر ان سزاؤں کے نفاذ میں کسی قسم کی حیل و حجت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مذکورہ بالا فیصلہ ملک سے اس نوع کے جرائم کے خاتمے اور نفاذ شریعت کی جانب ایک اہم پیش قدمی ثابت ہوگا۔"

وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ[1]

اب اس کے بعد اس سلسلہ میں وفاقی شرعی عدالت کا وہ فیصلہ بھی ملاحظہ فرمائیں جو ۱۰ اپریل ۱۹۸۱ء کو پاکستان ٹائمز کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یعنی :

" قرآن کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے اور یہی قول فیصل ہے۔ رجم کی سزا خلاف قرآن ہے اس لیے اس قانون کو منسوخ کر دینا چاہیئے۔ جس کی رو سے اسے حد (سزا) قرار دیا گیا ہے۔" اور اس کے بعد تحریر ہے کہ " اس بحث کا مخلص یہ ہے کہ ایک طرف سورہ نور کی آیت نمبر ۲ میں قرآن مجید کا صاف، واضح اور غیر مبہم اور دو ٹوک حکم موجود ہے اس کے ساتھ ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کوئی حدیث نہ قرآن میں تبدیلی کر سکتی ہے، نہ منسوخ کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس رجم کی سزا کے حق میں کچھ احادیث ہیں جو مبہم، غیر متعین اور باہمد گر متضاد ہیں بلکہ بعض ایسی جن کا حدیث ہونا بھی مشکوک ہے۔ فقہا کے اقوال بھی غیر یقینی اور متضاد ہیں۔ اندریں حالات نیز ان حقائق کے پیش نظر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں اور اس باب میں قطعاً تامل محسوس نہیں کرتا کہ میں سورہ نور کی آیت ۲ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوا قرآنی فیصلہ کی اطاعت کرتا ہوں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ زانی کی سزا خواہ وہ شادی شدہ ہو اور خواہ غیر شادی شدہ۔ پبلک کے سامنے کوڑے مارنا ہے۔"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کے خلاف وفاقی حکومت پاکستان نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی جس کا فیصلہ شاید ابھی تک نہیں ہوا۔

---

[1] "شرعی عدالت کا یہ فیصلہ غیر اسلامی ہے حالانکہ یہ سزا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔" (علامہ احسان الٰہی ظہیر
(بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۸۶ء۔ حرمہ میگزین)

پانچواں باب

قرأت کا اختلاف

فقہ، کتاب و سنّت اور مقامِ حدیث کے تذکرہ کے بعد اب ہم قرأت کے اختلاف کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تفاسیر و تراجم میں ہی اختلاف نہیں بلکہ اس کتابِ محفوظ کی لفظی عبارت میں بھی اختلاف ظاہر کیا جاتا ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ :-

قرأت سے مراد قرآن حکیم کے الفاظ کو مختلف طریق سے ادائیگی کے فرق کا نام ہی نہیں بلکہ یہ اختلاف بذاتِ خود الفاظ کی تبدیلی کا نام ہے۔

مودودی صاحب (مرحوم) کا مؤقف

چنانچہ مودودی صاحب مرحوم اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ : " یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید آج اصلی صورت میں موجود ہے جس میں وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا تھا اور اس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اس کے ساتھ قطعی صحیح ہے کہ قرآن میں قرأتوں کا اختلاف تھا اور ہے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے کا باقاعدہ علمی طریقہ پر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ محض سطحی نظر سے دیکھ کر بے تکلّف فیصلے کر دیتے ہیں کہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں اور ان میں لازماً کوئی ایک ہی بات صحیح ہے۔" (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

تمنّا عمادی

اس تحریر کی روشنی میں جناب علامہ تمنّا عمادی مدظلّہٗ (ڈھاکہ) کی اتباع میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ " باقاعدہ علمی طریقہ کون سا ہے جس کا مطالعہ کرنے سے دو متضاد چیزیں باہم متفق بلکہ متحد نظر آتی ہیں وہ باقاعدہ علمی طریقہ تو مجھ کو معلوم نہیں" البتہ مجھے اس موقع پر ان پریشان کن عقائد کا ہی ذکر کرنا ہوگا جن کی بنا پر قرآنِ حکیم کے الفاظ بدلے نظر آتے ہیں۔

عربی یا اردو زبان میں زبان دانی کے اصول کے پیشِ نظر یہ تو ظاہر ہے کہ الفاظ کا اختلاف اعراب اور نقاط کی شکل بدلنے پر ہی موقوف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے بانی نے اٹھائیس حرفوں میں سے بائیس حروف جو باہم متشابہ تھے ان کے مابین مختلف نقاط کے ذریعے فرق پیدا کیا ورنہ عربی یا اردو کے ایک لفظ " ب "

کے متعلق یہ بھی فیصلہ نہ کیا جا سکے کہ یہ ب ہے یا ٹ، ث ہے، ٹ ہے یا پ۔

اس کے باوجود

لیکن اس حقیقت کے باوجود قرآن حکیم کے سلسلہ میں مودودی صاحب مرحوم اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" بابت جون ۱۹۵۹ء میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکر رضؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمان رضؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی۔ اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی : کساب احکمت اللہ لہ فصلت من لدن حکیم حمید اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال بامعنی بنا کر ہی پڑھتے تھے لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہلِ زبان کو بکثرت التباسات پیش آجاتے تھے۔ اور یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشا کیا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ یوں لکھا گیا ہو کہ ربنا باعد بین اسفارنا تو اس کو رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا بھی پڑھا جا سکتا تھا اور رَبَّنَا بَعَّدَ بَيْنَ اَضْغَارِنَا بھی"۔ (اسی طرح کی ایک دوسری مثال بھی دی ہے)۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :

"یہ اختلافات تو اس رسم الخط کو پڑھنے میں اہلِ زبان کے درمیان ہو سکتے تھے۔ لیکن ایک عربی تحریر اگر اس رسم الخط میں غیر اہلِ زبان کو پڑھنی پڑ جاتی تو وہ اس میں ایسی سخت غلطیاں کر جاتے جو قبائل کے منشا کے بالکل برعکس معنی دیتی تھیں۔"

یہ اعراب اور نقاط کس نے لگائے ؟

اب سوال یہ ہے کہ پھر آخر ان نقاط اور اعراب کی ضرورت کب محسوس ہوئی۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب (مرحوم) کا ارشاد ہے :

"پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے

ابوالاسود دؤلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لیے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان ۶۵ھ تا ۸۶ھ کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے دو علماء کو اِس کام پر مامور کیا۔ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں منقوط اور بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین نقطے لگا کر فرق پیدا کیا۔ اور ابوالاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لیے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان دو گمنام علماء کا ممنون احسان ہونا چاہیئے کہ جنہوں نے حجاج بن یوسف والیٔ عراق کے حکم پر ۶۵ھ تا ۸۶ھ میں نقاط اور اعراب کا یہ اہم کام سرانجام دیا کہ جن کے بغیر "یہ تعین کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشا کیا ہے" اور جن نقاط اور اعراب کے نہ ہونے کی وجہ سے "اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھا کرتے تھے۔"

اعراب کا فائدہ

اس کے علاوہ اور کیا فائدہ ہُوا وہ بھی مودودی صاحب مرحوم کے الفاظ میں سُن لیجیے۔ فرماتے ہیں "ان کی بدولت قرأتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے ہیں۔"

شکر ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ فریضہ ہمارے دَور کے علماء کے سپرد کردیا جاتا تو نہ معلوم آج قرآن مبین کے ان محسوس الفاظ نے کیا شکل و صورت اختیار کی ہوتی اور نوع انسانی جن کے لیے یہ آخری ضابطہ حیات تھا آخر العمر اپنی رہنمائی کے لیے کس چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتی۔ افسوس! ایک طرف تو ہمارا ایمان ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل کتاب ہے اور دوسری طرف اس "تاریخی حقیقت" کو بھی تسلیم کیے آرہے ہیں کہ یہ کتاب عظیم اعراب اور نقاط تک کے بغیر آرہی تھی۔ بالعجب۔

لہ مودودی صاحب مرحوم کے نزدیک وضو کے دوران پاؤں دھونے کے متعلق سُنّی اور شیعہ حضرات کا اختلاف دو مختلف قرأتوں کی ہی بدولت ہے۔

اعراب وغیرہ کے بغیر نقصان

اعراب اور نقاط کے بغیر یہ کتاب کن کن خامیوں سے دوچار ہوتی، اس کی وضاحت خود مودودی صاحب مرحوم کے الفاظ سے ہی لگائیے۔ ارشاد ہے:

"اگر قرآن کی اشاعت کا دارومدار صرف تحریر پر ہوتا تو جس رسمِ خط میں امت کو یہ کتاب ملی تھی، اس کو پڑھنے میں تلفظ اور اعراب ہی کے نہیں، متشابہ حروف کے بھی کتنے بے شمار اختلافات ہوگئے ہوتے۔ محض زبان اور قواعد کی بنا پر خود اہلِ زبان بھی اگر نقطے اور اعراب لگانے بیٹھتے تو قرآن کی ایک ایک سطر میں بیسیوں اختلافات کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کسی ذریعے سے یہ فیصلہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ اصل عبارت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی وہ کیا تھی؟ اس کا اندازہ آپ خود اس طرح کر سکتے ہیں کہ اُردو زبان کی کوئی عبارت بے نقط لکھ کر دس بیس زبان دان اصحاب کے سامنے رکھ دیں گے کہ ان میں کسی کی قرأت بھی کسی دوسرے کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں نقطے اور اعراب لگانے کا کام محض لغت اور قواعد اور زبان کی مہارت کے بل بوتے پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ایک مصحف نہیں بے شمار مصحف[1] تیار ہو جاتے جن میں الفاظ اور اعرابوں کے ان گنت اختلافات ہوتے اور کسی نسخے کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہ کیا جا سکتا کہ ٹھیک اسی تنزیل کے مطابق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔"

---

[1] اس کی کوشش تو بہت کی گئی سات قاریوں کے سات اسکول قائم کیے گئے۔ مصحف ابی بن کعب اور مصحف عبداللہ بن مسعود اور مصحف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے نام سے مصاحف مشتہر کر کے ترتیب سور میں الٹ پلٹ تو کی ہی گئی۔ آیات کے الفاظ میں کمی بیشی اور الفاظ کے نقاط و اعراب میں بھی فرق قائم کیا گیا۔ مگر ان کے پاس نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کا کوئی علاج نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ سارے اختلافات کو ان کی تصنیف کردہ کتابوں اور روایات کے دفاتر تک ہی رہنے دیا۔ کسی ایک اختلاف کو بھی قرآن مجید میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے خود فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ط جو لوگ ہماری آیتوں میں کمی کریں گے وہ ہم سے کچھ چھپے نہیں رہیں گے۔

(تمنا عمادی غفرلہ)

اعراب اور نقاط کی اس قدر اہمیت کے باوجود کہ جن کو بغیر اردو یا عربی کی کوئی کتاب مکمل قرار دی ہی نہیں جاسکتی۔ قرآنِ حکیم جیسے نسخہ کیمیا کو اس خامی کے ساتھ نازل کر دیا گیا اور پھر یہ کہ اس خامی کا احساس نہ جبریلِ امین کو ہوا نہ اصحابؓ کو، نہ کاتبینِ وحی کو نہ رسولِ اکرمؐ کو حتیٰ کہ نہ ذاتِ خداوندی کو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں" مودودی صاحب مرحومؒ کا کہنا ہے:

" (۱) ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہلِ عرب ہی عام حروف عربی کے لیے اعراب کے نام سے آشنا نہ تھے ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم سے پہلے پہل نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر زبر پیش سے مسلم اہلِ عرب کو ۴۵ھ سے ۵۳ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا۔

(۲) اہلِ عرب " حروف کے لیے نقطے بھی ہونے چاہئیں" اس کو کبھی محسوس نہ کر سکے تھے بلکہ اسلامی عہد میں ہی صحابہؓ رسول صجبریل یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حروفِ تہجی کے لیے محسوس نہیں کی تھی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج بن یوسف نے دو گمنام عالموں کے ذریعے یہ ضرورت ایجاد کر کے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کر دیا۔ بس اسی وقت سے عربی حروف کے لیے نقطوں کی ضرورت دنیا کو محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بالکل بے ضرورت ہی تھے ورنہ اگلوں میں سے کسی کو تو اس کی فکر ہوتی۔"

خدا تعالیٰ کو بھی احساس نہ تھا

یعنی بالفاظ دیگر یہ ان دو گمنام عالموں کی مہربانی تھی جنہوں نے حجاج بن یوسف والیٔ عراق کے حکم پر اس غالباً خداوندی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اعراب اور نقاط کی خامیوں سے پاک کر دیا وگرنہ ذاتِ خداوندی تک کو اس چیز کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اگر کہیں کسی جگہ دو حفاظ میں کسی لفظ پر تکرار ہو جائے تو بغیر اعراب اور نقاط کے وہ کس طرح فیصلہ کریں گے کہ کون سا لفظ صحیح ہے اور کون سا غلط اور یا اگر کسی آبادی میں جہاں کوئی حافظ بھی موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں آج کی طرح یعنی بغیر سوچے سمجھے صرف ثواب حاصل کرنے کی خاطر، ناظرہ کی شکل میں قرآن حکیم کو پڑھنا چاہیں تو وہ اس عبارت کو سوائے اسکے کہ "اٹکل" سے پڑھیں، اور کیا کریں گے۔

افسوس تو یہ ہے کہ یہ مفروضے جنہیں تاریخی حقیقتیں کہہ کر پکارا جاتا ہے، یہ غلط تصورات صرف "مودودی صاحب مرحوم" تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہزار سال سے ہمارے ہاں ہر مسجد و محراب میں پیش کیے جاتے ہیں اور پھر ستم ظریفی یہ کہ ان غیر قرآنی حقیقتوں کو ہم نے اپنے تعلیمی نصاب میں داخل کر رکھا ہے۔ (تفصیل آگے آئے گی۔) یہ تو خدائے علیم و خبیر کا شکر ہے کہ ہمارے ان مروجہ افسانوں کے برعکس خدا کے ہاتھ سے اس نازل کردہ قندیلِ آسمانی کی ایک ایک کرن اپنی اصلی، مکمل اور آخری شکل میں بغیر کسی انسانی ذہن کی

کمیزش کے پہلے دن سے ہی یقینی طور پر لاریب، مبین، واضح، روشن اور بغیر کسی خامی کے قلب نبی پر اُتاری گئی اور پھر اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا تاکہ نوعِ انسانی جب چاہے اپنے ناکام تجارب سے تنگ آکر اپنا سفر حیات از سرِ نو شروع کر سکے تو اس کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ متشکل کرنے کے قابل بن سکے جس میں نہ خوف ہو نہ حزن۔ ورنہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان اعراب اور نقاط کا فریضہ کہیں ہمارے سپرد کر دیا جاتا تو پھر نہ معلوم اس نسخہ کیمیا کے الفاظ کی محسوس شکل و صورت کیا ہیئت اختیار کر جاتی۔ اور اس کے بعد نوعِ انسانی اپنے اُلجھے ہوئے مسائل کے حل کی خاطر زمانہ حال کی طرح تاقیامت کس کس کے در پر سجدہ ریز ہوتی دکھائی دیتی لیکن اگر یہ دیکھنا ہو (خود تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے) کے مصداق کہ نئی نسل کو یہ تعلیمی زہر کس طرح پلایا جا رہا ہے تو اس کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ غور ہے جو جماعت نہم و دہم میں پڑھائی جانے والی اسلامیات لازمی (سنی طلباء کے لیے) سے حاصل کیا گیا ہے۔ جسے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور نے تیار کیا ہے۔

ہمارا نصابِ تعلیم

قرآنِ حکیم کی تدوین

مذہبی خدمات میں آپ (حضرت عثمان رض) کا سب سے اہم کارنامہ مسلمانوں کو قرآن کریم کی ایک قرأت پر متحد کرنا ہے۔ قرآن حکیم اگرچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں مدون ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ کلام اللہ کے بعض الفاظ کا تلفظ کئی طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اصحابؓ [illegible] تلفظ مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ عرب میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی بعد والوں کے لیے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت عثمان نے وہ نسخہ منگوایا جو حضرت ابو بکرؓ نے مدون کیا تھا اور جو ام المومنین حضرتِ حفصہ رض کے پاس محفوظ تھا۔ آپؓ نے اس کی مختلف نقلیں کرا کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ اس طرح ساری دنیا کے مسلمان قرآن حکیم کی ایک ہی قرأت اور ایک ہی تلفظ پر متفق ہو گئے۔ ایک مدت تک وحی کی خدمت آپ کے سپرد رہی۔"

صاحبِ نصاب حضرات

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے۔ یاد رہے اس کی تیاری کے لیے جن مختلف حضرات کی خدمات حاصل کی گئی ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں: مولانا محمد بخش مسلم، مولانا عبدالقادر آزاد، مولانا

محمد حنیف ندوی، مولانا ضیاء القاسمی، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا، ڈاکٹر مجیب الرحمان قاضی، پروفیسر محمد احمد قاضی، پروفیسر محمد علی سانگی اور سید نورالحسن بخاری۔

چند ایک اہم سوالات

بہرحال اس تحریر کی روشنی میں اگر کوئی طالب علم ان حضرات سے پوچھ لے کہ جناب عالی (۱) کیا رسول خدا کی ذات اقدس و اعظم نے اس ضرورت کو بھی محسوس نہ کیا کہ اِس آخری ضابطہ حیات کو کتابی شکل میں اپنی زیر نگرانی مدون کرانا کس قدر ضروری ہے۔ جب کہ آپؐ کے بعد کسی نبی نے بھی نہیں آنا تھا؟ (۲) اور جو اندیشہ صحابہ کرامؓ کو درپیش ہُوا کیا رسولِ خدا اس قسم کے سطحی اندیشے کا بھی احساس نہ کر سکے۔ معاذ اللہ۔ (۳) خدا نے اپنے کلام کے شروع میں جب یہ فرمایا کہ اس کتاب میں کوئی تضاد نہیں یہ لاریب ہے تو کیا یہ کتاب بکھرے ہوئے اوراق کا نام تھا اور رہے؟ کیا کبھی بکھرے ہوئے اوراق کو جن کی ابھی شیرازہ بندی نہ کی گئی ہو کیا وہ کتاب کہلا سکتی ہے؟ کتاب تو وہ کہلاتی ہی تب ہے جب وہ کتابی شکل میں ہر لحاظ سے مکمل اور مدوّن ہو کر سامنے آجائے۔ (۵) کیا یہ عجیب بات نہیں کہ صحابہ کرام رضؓ جیسی شخصیات قرآن حکیم جیسی کتاب کی املا اور تلفظ مختلف طریقوں سے لکھیں اور پڑھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی اس غلطی کو کوئی اہمیت ہی نہ دیں؟ اور (۵) کیا یہ بات صحابہ کرام رضؓ کے شایان شان قرار دی جا سکتی ہے؟ (۶) اور آخر پر یہ کہ کیا کسی قانون کی کتاب کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں اس قدر قرأت کا اختلاف ہو اور اس کے باوجود اسے مکمل کتاب ہی گردانا جائے۔

اگر ان تمام باتوں کا جواب نفی میں ہے (اور یقیناً ہے) تو پھر اس تحریر اور نصابِ تعلیم کے کیا معنی جو ہمارے ذہنوں کی سفید اور صاف تختی پر کالی سیاہی سے لکھی جا رہی ہے۔ نوجوان نسل ہم سے پوچھتی ہے کہ کیا اس تمام بحث کا ماحصل اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ نبی اکرمؐ کی ذات پر جو قرآن حکیم نازل ہُوا اس پر نہ اعراب تھے نہ نقاط بلکہ یہ آپؐ کی زندگی مبارک کے بعد ۶۵ھ تا ۸۶ھ میں دو علماء نے اپنی دانست کے مطابق لگائے۔ ان اعراب و نقاط کے بغیر صحابہ کرام رضؓ قرآن حکیم اٹکل سے پڑھا کرتے تھے۔ اور آخر کار ان علامات کا فائدہ یہ ہُوا کہ قرأت کا اختلاف امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند متواتر اور مشہور اختلافات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اور جہاں تک اس کتاب کی تدوین کا تعلق ہے وہ بھی رسولِ خدا کی زندگی میں مکمل نہ ہوئی تھی بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے دور میں یہ "نامکمل کتاب" بغیر اعراب و نقاط کے مدون ہوئی جس کا ایک ہی نسخہ حضرت حفصہ رضؓ کے پاس محفوظ تھا جبکہ نبی اکرمؐ کے دور میں دس لاکھ مربع میل تک کا علاقہ آپ کے کنٹرول

میں آ چکا تھا اور پھر حضرت عمرؓ کے دور میں اس کی وسعت ۲۲ لاکھ مربع میل تک پھیل چکی تھی اور پھر جس کے استحکام کی خاطر آپؓ نے زندگی کے ہر شعبہ کے لیے بڑی دُور رس اصلاحات نافذ کیں۔ لیکن (ان بیان کردہ افسانوں کی روشنی میں) کچھ اگر کیا تو وہ یہ کہ اس ایک نسخہ کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) قرآن حکیم کی نشر و اشاعت کا کوئی انتظام نہ کیا۔ البتہ حضرت عثمان رضؓ کے دور میں اس خامی کو محسوس کیا گیا اور پھر آپؓ نے اس ایک نسخہ سے مزید نسخے لکھوائے اور اس طرح دنیا بھر کے مسلمانوں کو قرآن حکیم کے ایک ہی تلفظ اور ایک ہی قرأت پر متفق کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔ نیز بقول مودودی صاحب مرحوم کے آئندہ کی خاطر "آپؓ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے عربی والے قرآن کو باقی رکھا اور باقی چھ[1] زبانوں والے قرآن جلا دیے تاکہ مسلمانوں میں انتشار پیدا نہ ہو۔ جبکہ ان کو جلانے کا حکم نہ خدا نے آپؓ کو دیا تھا اور نہ رسولؐ خدا نے" اور اس طرح مسلمان اس انتشار سے بچ گئے جن کا ان حضرات کو خطرہ تھا۔

ایک گذارش

ان مروّجہ عقائد کے اس خلاصہ پر ہمارے خیال میں کسی مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ سوائے اس کے، کہ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق یہ کہا جائے کہ "سوچا کرو" لیکن سوچے گا تو وہی جو عقل و بصیرت سے کام لے گا۔ قرآن حکیم کی تحریر اور تدوین کے سلسلہ میں قبل اس کے کہ ہم اِس وادیٔ پُرخار سے باہر قدم رکھیں اس کا ابھی ایک گوشہ باقی ہے۔ جس کا ذکر کیے بغیر ہمارا یہ سفر نا تمام سا معلوم ہوتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے میرے لیے ایک بار پھر یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ جو کچھ راقم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھا جائے گا اس سے قطعی طور پر کسی شخصیت کی تذلیل مقصود نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر دین دنیا کے معاملات میں اس ذہنیت کو زادِ راہ بنا لیا جائے تو پھر نہ ادب ادب رہتا ہے اور نہ علم علم۔ بلکہ اس عمل سے انسان کی اپنی شخصیت صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور عقل و شعور کی بارگاہ سے سوائے ذلّت و رسوائی کے اس کے کچھ حصّے نہیں آتا لہٰذا میری التماس یہ ہے کہ ان گذارشات کو خالصتاً علمی سطح پر پرکھا اور دیکھا جائے۔ اگر یہ سب کچھ صحیح ہیں تو پھر سوچا جائے کہ ملّتِ اسلامیہ جو اس قسم کے غیر آئینی گرداب میں متواتر اُلجھی چلی آ رہی ہے اُسے اس سے کس طرح نکالا جا سکتا ہے۔ میری اس دلسوزی کا صرف اور صرف یہی مقصد ہے اور کچھ نہیں ؎

میں اس آس پہ سُلگا رہا ہوں دل کی چنگاری کبھی تو آگ بھڑکے گی کبھی تو روشنی ہو گی

اس کے بعد اس گوشہ کی طرف آیئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ناسخ و منسوخ کا گوشہ۔

---

[1] قرآن مجید سات زبانوں میں کس طرح نازل ہوا، اس کی تفصیل ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے شمارہ مئی ۱۹۷۶ء میں بھی پیش کی گئی ہے۔

چھٹا باب

ناسخ و منسوخ

ناسخ و منسوخ کے سلسلہ میں تمہیداً یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ کسی بھی نظام کو پایہ تکمیل تک پہنچنے یا پہنچانے کے لیے یہ لازم ہے کہ اس نظام میں ان تمام تدریجی مراحل کی نشاندہی موجود ہو جو اس کے لیے ضروری ہیں تاکہ وہ قوم جو اپنے آپ کو اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہے وہ باآسانی اپنے سفر کا آغاز اس مقام سے کر سکے جس مقام پر وہ کھڑی ہے۔ کیونکہ اگر کسی نظام کے خدوخال میں صرف کسی ایک ہی مرحلہ کی نشاندہی کی گئی ہو تو اس معاشرہ کے لیے کبھی یہ ممکن نہ ہو سکے گا کہ وہ قوم ان مطلوبہ نتائج کو حاصل کر سکے جو ایک خوبصورت معاشرہ کا خاصہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان تدریجی نشاندہیوں کے بغیر اس معاشرہ کو جمود کے اس گڑھے سے نکالنے کا کوئی اور طریق ممکن ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا نبی ہر لحاظ سے ایک مکمل نظامِ حیات کا داعی تھا تاکہ وہ نوعِ انسانی کو بتدریج اس منزل کی طرف کشاں کشاں لے جائے جو مقصودِ حیات ہے لہٰذا اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایک مرحلہ کے لیے دیئے گئے اصول و قوانین بھی اتنے ہی ضروری ہوتے ہیں جتنے کہ دوسرے مرحلے کے۔

تدریجی مراحل کے مطابق راہنمائی

قرآن حکیم نے اپنے ہاں اس انداز کو اپنایا ہے۔ نزولِ قرآن کے دور میں عرب جیسی مخاطب قوم کو شراب کی ممانعت کے لیے جو ۱۵ سال کا عرصہ دیا گیا تھا، اس میں یہی حکمت پوشیدہ تھی یا مثلاً اگر آج ہم بھی قرآن کے معاشی نظام کو اپنے ہاں اپنانا چاہیں تو رزق کے تمام سرچشمے جو اصولاً مملکت کی تحویل میں ہونے چاہئیں، اُن کے لیے فوری طور پر کوئی انتہائی قانون نافذ نہیں کر سکیں گے۔ ایسا کرنے سے پورے کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور وہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوں گے جن کے لیے یہ انقلابی قدم اٹھایا گیا ہو۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسا بتدریج ہی ہو سکے گا اور اس نظام کی اتباع کے لیے پوری ملت کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا تاکہ وہ اس نظام کے ثمرات اور طریق کار سے پوری طرح آگاہ ہو سکے جو اس منزل کی ابتداء اور انتہا کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ

اگر یہ دونوں عوامل (تدریجی مراحل اور ذہنی آبیاری) میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے نتیجہ میں جو کچھ بھی حاصل ہوگا اسے بدنظمی اور ہنگامہ آرائی کا نام تو دیا جا سکتا ہے ایک خوش آئند انقلاب کا پیش خیمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآنی احکام منسوخ نہیں ہوا کرتے

ان تصریحات سے واضح ہے کہ تدریجی مراحل یا ہنگامی حالات کے لیے دیئے گئے اصول و قوانین اگر کسی مملکت کے لیے اس کے اپنے حالات کے مطابق قابلِ عمل نہ ہوں تو اصول و قوانین منسوخ نہیں ہو سکتے۔

بلکہ ان پر تو وہاں عمل ہو رہا ہوتا ہے جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے — چنانچہ قرآن حکیم کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں کیا گیا ورنہ عام تصوّر کے مطابق اگر قرآن حکیم کی ۵۰۰ آیات منسوخ ہو چکی ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آیات منسوخ ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل ہی نہیں رہیں۔ تو — کیا انہیں صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے؟ العجب۔

مثلاً تیمم کا حکم وہاں ساقط سمجھا جائے گا جہاں اس کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ چنانچہ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قرآن حکیم کا کوئی حکم مستقل طور پر ساقط بھی نہیں رہتا چہ جائیکہ اسے منسوخ قرار دے دیا جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ قدرت نے بعض احکام و اقدار جو سابقہ اقوام کے لیے متعیّن کی گئی تھیں انہیں ہمارے لیے منسوخ کر دیا ہو اور اس کی جگہ کوئی بہتر یا مزید ارتقا یافتہ شکل میں اور اقدار دے دی ہوں۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ جو قانون اور اقدار قرآن حکیم کی دفتین میں محفوظ ہیں اُن میں سے کوئی حکم منسوخ قرار دیا گیا ہو۔ منسوخ شدہ قانون کو محفوظ کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں رہتا۔

پرویز صاحب کا ارشاد

ناسخ و منسوخ کے متعلق جناب پرویز صاحب نے اپنی کتاب "تبویب القرآن" میں جو کچھ تحریر فرمایا، قارئین کے استفادہ کے لیے اسے یہاں درج ذیل کیا جا رہا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد موضوع زیرِ نظر کے سلسلہ میں مزید کسی قسم کی کوئی تشنگی باقی نہیں رہے گی۔

"قرآن نے بتایا ہے کہ آسمانی رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع سے جاری رہا ہے لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ رسول کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی وحی میں انسانی خیالات کی آمیزش کر دی جاتی۔ اس کے بعض حصّے فراموش ہو جاتے۔ بعض حوادث ارضی و سماوی کی وجہ سے بالکل مٹ جاتے اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ وہ خدا کی وحی کی رُو سے :

(i) ان احکام کو پھر سے جاری کر دینا جن کا جاری رکھنا منشائے خداوندی تھا۔

(ii) جو احکام وقتی طور پر دیئے گئے تھے، انہیں یا تو منسوخ کر دینا۔ اور یا ان کی جگہ ان سے بہتر احکام دے دینا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ خدا کا آخری رسولؐ آیا۔ اس نے خدا کی وحی کے مطابق، جو دین عطا کیا اس میں :۔

(i) ایسے احکام علیٰ حالہٖ موجود رکھے گئے جو انبیاءِ سابقہ کی وساطت سے دیئے گئے تھے اور ابدی طور پر جاری رکھے جانے والے تھے اور اپنی اصلی شکل میں موجود تھے۔

(ii) جو احکام ایسے تھے جن کا ابدی طور پر جاری رکھنا مقصود تھا لیکن جن میں یا تو انسانی خیالات کی آمیزش ہو گئی تھی اور یا وہ محو ہی ہو گئے تھے۔ انہیں از سرِ نو منزہ شکل میں دیا گیا۔

(iii) سابقہ انبیاء کی وحی میں جو احکام ایسے تھے جن کا باقی رکھا جانا مقصود نہیں تھا، انہیں شاملِ وحی نہ کیا گیا۔ اور

(iv) جن مزید احکام کی ضرورت تھی، ان کا اضافہ کر دیا گیا۔

اس طرح دین کو مکمل کر دیا اور اسے غیر متبدل قرار دے کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

(۱۱۶ : ۶ — ۹ : ۱۵)

لہٰذا، قرآن میں کوئی حکم ایسا نہیں جو منسوخ ہو۔ یہ ابدی ضابطۂ حیات ہر طرح سے مکمل اور غیر متبدل ہے۔ قرآن کریم کی آیت (۱۰۶ : ۲) میں جس نسخ کا ذکر ہے، اس کا تعلق، سابقہ انبیاء کی وحی سے ہے قرآن کریم سے نہیں۔ اسی کی تائید (۱۰۲ — ۱۰۱ : ۱۶) سے ہوتی ہے اور (۵۳ - ۵۲ : ۲۲) سے بھی۔"

کسی ملک و قوم کے لیے آئین کی تدوین کس قدر ضروری اور اہم ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آئندہ صفحات میں ہم آئین کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر گفتگو کریں گے۔

ساتواں باب

اِسلامی آئین کی تدوین اور علمائے کرام

قانون کی اہمیت

قوموں کے چہروں کی شادابی و پژمردگی اور اس کے عروج و زوال کی داستان اس نظام سے وابستہ ہوتی ہے، جسے اس نے اپنے ہاں وضع اور قائم کر رکھا ہو اور جہاں تک نظام کا تعلق ہے تو یہ دراصل اجتماعی طور پر سفرِ زندگی کے طریق کا ہی دوسرا نام ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قانون اور نظامِ زندگی ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں — اور یہی وجہ ہے کہ قوموں کی تقدیر نظام کی رہینِ منّت ہوتی ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، یہ خطۂ زمین اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں حکمِ خداوندی کے مطابق قانون نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۲۸ سال کے طویل عرصہ سے ہمارے ہاں ہر مسجد و محراب سے اعلان کیا جا رہا ہے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نافذ نہیں ہوگا۔

پیر محمد اشرف صاحب کا انٹرویو

لیکن کسی قانون کا نفاذ تو تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب وہ مدوّن شکل میں موجود ہو۔ چنانچہ ہمارے درمیان غور طلب سوال یہ ہے کہ یہاں علمائے دین نے قانون کی تدوین میں کیا کردار ادا کیا۔ سو یہ جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں کالعدم جماعتِ اسلامی کے سابقہ قائمقام امیر جناب پیر محمد اشرف صاحب کا وہ انٹرویو دیکھنا ہوگا جو ۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کو روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین میں جناب جاذب سہیل صاحب کی طرف سے شائع ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ:

"میاں یاسین وٹو اور کئی دوسرے کالعدم پیپلز پارٹی کے رہنما میرے دوست تھے۔ یہ غالباً اپریل ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ "مولانا مودودی صاحب بھٹو سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی تصفیہ کی راہ نکل آئے اور آگ اور خون کا یہ کھیل بند ہو سکے۔" میری اس بات پر توجہ دی گئی اور میرے کہنے پر مولانا مودودی اور بھٹو

کی اچھرہ میں مشہورِ زمانہ ملاقات ہوئی۔ ہماری حکمتِ عملی یہ تھی کہ مولانا سے بھٹو کی ملاقات بھی کرا دیں اور بھٹو کی کسی پیشکش کو مسترد بھی کر دیا جائے۔ اس میں ہم سو فی صدی کامیاب ہوئے"
اور اس کے علاوہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ " میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے مارشل لاء لگنے کی خوشی میں دیگیں پکائی تھیں۔" قائمقام امیرِ جماعتِ اسلامی اور یہ فلسفۂ حیات !!

صدر ایوب کی کوشش

انٹرویو کے دوران جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ایوب خان کے دَور کو کیسا پایا تو جناب اشرف صاحب نے فرمایا کہ :

" میں سمجھتا ہوں کہ صنعتی ترقی اور کاروباری لحاظ سے وہ سنہری دَور تھا۔ میں پہلی بار انکشاف کر رہا ہوں کہ ایوب خان نے مارشل لاء لگانے کے بعد آئین کو اسلامی بنانے کے لیے تمام دستاویزات مولانا مودودی کے پاس بھجوا دیں اور کہا " آپ مجھے اسلامی آئین بنا کر دے دیں میں اسے ملک میں نافذ کر دوں گا۔" مولانا مودودی (مرحوم) نے چودھری غلام محمد مرحوم کو کراچی سے، مجھے ساہیوال سے، نوابزادہ نصراللہ اور میاں طفیل محمد کے ساتھ ایک نشست رکھی جس میں اس مسئلے پر غور کیا گیا۔ میں نے اس میٹنگ میں کہا " جماعت کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیئے ورنہ قادیانی اس کے گرد گھیرا ڈال لیں گے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اسلامی دستور بنا کر دے دینا چاہیئے تاکہ ملک میں اسلام نافذ ہو سکے۔"

اس انکار کی تہہ میں کیا جذبہ پوشیدہ تھا جناب اشرف صاحب کے ہی الفاظ میں سُنیئے۔ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ " آپ کے خیال میں ایوب خان کی بات مان لینی چاہیئے تھی؟" تو اس پر آپ نے فرمایا :

" جی ہاں! اگر اس وقت اسلامی دستور بنا کر اسے دے دیا جاتا، اس کے ساتھ تعاون کیا جاتا تو بلا مبالغہ اس میں جماعت اسلامی کا فائدہ بھی تھا کہ اس ملک میں نظامِ اسلام کی یہ واحد نمائندہ جماعت ہے اور پھر اس کا دیا ہُوا اسلامی دستور نافذ ہو جاتا تو اس کی فکری توقیر میں اضافہ ہوتا۔ یہ سمجھا گیا کہ ایوب خان کو ہٹا کر خود اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔ مگر یہ تجربہ غلط ثابت ہُوا۔ دس سال گذر گئے۔ پھر یحییٰ خاں اور بھٹو کے دور میں کالعدم جماعت اسلامی کے کہیں پاؤں نہ جم سکے۔"

جناب اشرف صاحب کے یہ الفاظ کہ

" یہ سمجھا گیا کہ ایوب خان کو ہٹا کر خود اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔" قابلِ غور ہیں۔

صدر ایوب کی پیش کش

صدر ایوب نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

" اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کیے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔" صدر نے کہا " یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح کہ خدا اور رسولؐ کی منشا تھی تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا" صدر نے کہا " میں نے ہمیشہ علماء سے کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں۔ اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اس قانون کے حق میں عوام کی تائید بھی حاصل کریں، اور اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

چنانچہ صدر ایوب کی اس اپیل پر جناب مودودی صاحب نے فرمایا :

" سب سے پہلے تو انہوں نے (صدر نے) مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہی چیز اسلامی قانون کے نفاذ میں مانع ہے۔ حالانکہ جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا۔ جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لاز (یعنی ان کی اپنی فقہ) کے مطابق کیے جائیں گے۔ اس لیے شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹ عائد ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دُور کی جا چکی ہے اور اب ان اختلافات کو نفاذِ شریعت میں مانع قرار دینے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۲ر جنوری ۱۹۶۹ء)

نہ معلوم ان ۲۲ نکات میں وہ کون سی شق ہے جس کی رو سے یہ طے پایا ہے کہ " ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔ علاوہ ازیں مودودی صاحب

کے نزدیک قرآن کریم جیسی لاریب اور محفوظ کتاب کے مقابلے میں سنّت کی وہ کون سی لاریب اور محفوظ کتاب ہے جس کے مطابق ایک متفقہ علیہ قانون بنایا جا سکے گا۔ جبکہ مرحوم کو ۱۹۷۰ء میں اس چیز کا خود اعتراف کرنا پڑا کہ کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق ہو۔" (بحوالہ ایشیا ۲۲ اگست ۱۹۷۰ء)

لیکن اس کے باوجود مطالبہ پھر بھی یہی ہے کہ پاکستان کا قانون کتاب و سنّت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

آئین کی تدوین کے سلسلہ میں صدر ضیاء الحق کا بیان

صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے سندھ مدرسۃ الاسلام کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"قائدِ اعظم محمد علی جناح پاکستان میں قرآنی آئین نافذ کرنا چاہتے تھے (اور اس مقصد کے لیے) ان کی ہدایات پر پہلی آئین اسمبلی کی راہنمائی کے لیے قرار داد مقاصد بھی منظور کی لیکن افسوس اِس قرارداد کے مطابق پاکستان میں کوئی آئین نہیں بنایا جا سکا۔ وہ بھی جو منسوخ ہو گئے اور وہ بھی جس کی مکمل بحالی کے لیے تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۸۵ء)

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہے مملکتِ پاکستان کے لیے اسلامی آئین کی تدوین کا مسئلہ ۳۹ سال سے لاینحل پڑا ہے لہٰذا جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر یہاں اسلامی نظام کا نفاذ کیسا اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کیسی۔

جناب چیف جسٹس کی اپیل

اس قسم کی ایک اور عملی مثال وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس جناب آفتاب حسین صاحب کی وہ اپیل ہے جو انہوں نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے علماء اور دانشوروں سے کی کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے وفاقی شرعی عدالت سے تعاون کریں۔ آپ نے فرمایا کہ:

"انہوں نے بار بار اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے لیکن ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلہ میں وکلاء اور علماء حضرات نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں دکھایا۔" انہوں

نے کہا" علماء زبانی کلامی تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عملاً انہوں نے تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا" انہوں نے بتایا کہ" وفاقی شرعی عدالت کی دعوت پر چند علماء نے کچھ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلہ میں اپنی آرا پیش کی تھیں لیکن انہوں نے اپنی اس رائے میں صرف فقہ کو تحریر کر دیا تھا اور اکثر جگہوں پر قرآن اور حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا اس لیے یہ آراء ہماری مناسب مدد نہیں کر سکیں۔" انہوں نے کہا" وکلاء بغیر فیس کے مشورہ نہیں دیتے اس لیے وکلاء نے وفاقی شرعی عدالت سے بھی قابلِ ذکر تعاون نہیں کیا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۸۲ء)

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس صاحب کے اس بیان کے بعد اسی قانون سازی کے سلسلہ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے سردار عبدالقیوم صاحب (سابقہ صدر آزاد کشمیر) کے انٹرویو کے حوالہ سے اس طرح پردہ کشائی کی ہے کہ

سردار عبدالقیوم کا انٹرویو

"آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار عبدالقیوم صاحب پچھلے دنوں "جنگ فورم" میں تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ جب وہ آزاد کشمیر کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ جس اسلام کا نام ساری عمر لیتے رہے ہیں، اب وہ اسے نافذ کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو انہوں نے راہنمائی کے لیے دو سو کے قریب ملک کے ممتاز ترین علماء کو خطوط لکھے اور علماء سے درخواست کی کہ وہ انہیں بتائیں کہ وہ اسلام کس طرح نافذ کریں۔ سردار صاحب کہتے ہیں کہ دو سو علماء میں سے صرف دو تین علماء نے انہیں جواب دیا۔ گویا باقی کے پاس بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں ورنہ جب ایک بااختیار شخص اسلام کو نافذ کرنے کے لیے خود راہنمائی طلب کرتا ہے تو ان کا خاموش رہنا قابلِ فہم نہیں ہو سکتا۔"

علماء کے بائیس نکات اور فرقہ بندی

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت کے لیے ۴۰ سال کے طویل عرصہ میں علماء حضرات نے کوئی قابلِ ذکر خدمت انجام نہیں دی۔ البتہ ۱۹۵۱ء میں ۲۲ نکات کے تحت یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا (جن کا مختصر ذکر پہلے بھی آ چکا ہے)۔ کہ

۱۔ اسلامی مملکت کا فرض ہوگا کہ کتاب و سنت کے بتائے ہوئے معروضات کو قائم کرے منکرات کو مٹائے اور شعار اسلام کے احیاٗ اور متعلقہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۲۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہو گا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

یعنی بالفاظِ دیگر فرقہ بندی کو قائم رکھنے کے لیے مخصوص نظریات کے تحت علیحدہ علیحدہ دارالعلوم قائم رکھے جائیں گے تاکہ ایسے افراد تیار ہوں کہ جن کے نہ تو عمر بھر آپس میں دل جُڑ سکیں نہ سر اور ان درسگاہوں کے تعلیم یافتہ قاضی قانون فرقہ بندی کے ماہر قرار پائیں۔ اور ۹ سال کے طویل عرصہ میں یہاں طالب علموں کو نفسیاتی طور پر جذباتیت کے مہلک مرض میں اس قدر مبتلا کر دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے فقہی احصار کے باعث سر سید کی یہ پکار سُن ہی نہ سکیں کہ "اسلام صرف قرآن حکیم میں ہے۔"

نظر و فکر (جامعہ نعیمیہ) گڑھی شاہو لاہور

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ لفظ بہ لفظ حقیقت پر مبنی ہے اور ہمارے موجودہ دارالعلوم اس کی شہادت خود آپ ہیں۔ اس وقت میرے سامنے جامعہ نعیمیہ رجسٹرڈ گڑھی شاہو لاہور کا تعارفی پمفلٹ ہے۔ جس میں اس دارالعلوم کے اغراض و مقاصد، سالہ تعلیمی نصاب، مدرسین کے ضوابط اساتذہ اور طلبا کے لیے شرائط درج ہیں۔ جہاں تک اس کی عمارت کا تعلق ہے، اس پر دیگر مذہبی دارالعلوموں کی طرح لاکھوں روپے صرف ہو چکے ہیں۔ اس پمفلٹ کے صفحہ ۳۵ پر اغراض و مقاصد کے عنوان کے تحت مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر ہے:

(۱۰) اس جامعہ کا مسلک خاص اہلسنت و جماعت کے مطابق فقہ حنفی ہوگا۔

(۱۱) جمعیت عالیہ کے ہر رکن کا مسلک قرآن و سُنت کی تشریحات (قرآن حکیم کے مطابق نہیں بلکہ) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مسلک، حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رح اور حضرت صدر الافاضل مولانا حافظ

ھ راقم

محمد نعیم صاحب فاضل مراد آبادی قدس سرہٗ کے مطابق ہونا لازم ہوگا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے"
اور جو شخص ان بزرگوں کی کسی تحریر یا مسلک سے اختلاف کرے گا اس کے متعلق تحریر ہے کہ

وہ شخص رکنیت سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے (جو)

(۱۷) خدانخواستہ جامعہ کے مسلک کی دفعہ ۱۲ کے انحراف کرے (صفحہ ۳۶)

اس کے صفحہ ۳۸ پر مدرسین کے لیے ضوابط فارم کی شق اوّل یہ ہے کہ

"مسلک اہلِ سنّت وجماعت بمطابق فقہ حنفی کا پابند رہوں گا اور (۲) یہ کہ حضرت صدر الافاضل السیّد الحافظ محمد نعیم الدّین صاحب قدس سرہٗ فاضل مراد آبادی کے ہم عقیدہ رہوں گا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔"

یعنی جو شخص یہ کہے قول فیصل صرف قرآن حکیم ہے اور اس کے علاوہ کسی بزرگ کی تعلیم اور اس کا کوئی خاص مسلک اس کے لیے سند قرار نہیں پاسکتا تو وہ شخص ان حضرات کی سوسائٹی کا نہ ممبر بن سکتا ہے نہ ہی اس دار العلوم کا طالب علم۔ کیونکہ ان کے اپنے الفاظ میں طالب علموں کو جن امور کا پابند ہونا ضروری ہے اس کے مطابق ہر طالب علم کو یہ تحریری طور پر لکھ کر دینا پڑتا ہے کہ:

"جامعہ نعیمیہ کی کتب چارپائی اور دیگر سامان کی حفاظت کروں گا اور مسلک بریلوی اہلسنّت وجماعت کی ترویج واشاعت کروں گا۔" (بحوالہ تعارف جامعہ نعیمیہ لاہور صفحہ ۳۹)

جہاں تک ان دار العلوموں میں قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کی دعوت کا تعلّق ہے تو یہ چیز ان طلباء کے کورس میں ہی شامل نہیں۔ البتہ عربی بول چال سکھا دی جاتی ہے — اور اسی قسم کے حقائق جامعہ اشرفیہ لاہور کے علاوہ ملک کی باقی مذہبی یونیورسٹیوں کے متعلق ہیں۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر آنے والی نسل اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر تصریفِ آیات کے تحت اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہوئے اپنے لیے راہنمائی طلب کرے۔ کیونکہ تعلیماتِ قرآنی تو وہ بحرِ زخار ہے، کہ آپ جوں جوں آگے بڑھتے جائیں گے توں توں اس کی وسعتیں مزید آگے پھیلتی جائیں گی۔ قرآن حکیم تو خارجی کائنات کی مانند ایک نہ ختم ہونے والا خزینہ ہے لیکن جس قوم نے اس کی تعلیم کو کسی خاص دور کے من پسند افراد کی سوچ تک ہی محدود کر رکھا ہو وہ اس سے کیا حاصل کرے گی؟۔ اس لیے ان حالات میں یہ توقع کرنا کہ فرقہ بندی اور فرقہ بازی کی موجودگی میں قرآن خالص کو بنیاد تسلیم کیے بغیر ہم کسی متفق علیہ اسلامی آئین کو ترتیب دے لیں گے نہ صرف یہ کہ یہ امر محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

یورپ کی اسلامی کونسل

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے ۸۴-۱۹۸۳ء میں یورپ کی اسلامی کونسل کا مرتّب کردہ اسلامی دستور کا مسودہ (یا خاکہ) پاکستان آیا اور اس کی دفعہ (۱) الف میں کہا گیا تھا کہ :

"حاکمیت بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی ہے اور مقتدرِ اعلیٰ شریعت ہے۔"

اور شق 'ب' میں تحریر تھا کہ "شریعت قرآن و سنّت سے عبارت ہے اور قانون سازی اور طرزِ حکمرانی کا ماخذ ہے۔" جبکہ حالت یہ ہے کہ سنّت ہر فرقے کی علیحدہ علیحدہ ہے۔

علّامہ اقبال کی قرآنی بصیرت

سو یہ ہے باہمی نفاق و انتشار کی وہ سنگلاخ اور خاردار وادی جس میں ملّتِ پاکستان ۳۸ سال سے خیمہ زن چلی آ رہی ہے اور ایک صحیح اسلامی آئین کی تدوین کے سلسلہ میں اس قدر تذبذب کی شکار ہے کہ ہر کوئی بے بسی و بے کسی کے عالم میں ایک تصویر بنا بیٹھا ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں اس جہنّم سے نکلنا چاہیئے اور آئندہ نسلیں بھی ہمیں مجرم قرار نہ دیں تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم اقبال جیسے مفکرِ قرآن اور دیدہ ور کی یہ آواز بغیر کسی تعصّب کے سُن لیں۔ جسے، انہوں نے اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں کچھ اس طرح بلند کیا ہے :

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیّر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لیے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیّر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر مبتدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ

ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیّر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

طلوع اسلام کا تبصرہ

علامہ اقبال کا یہی وہ ارشاد تھا جس کی روشنی میں ادارہ طلوع اسلام لاہور نے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ:

"قرآن کریم کے ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رکھا جانا نہ مقصود دین تھا نہ منشائے رسالت۔ یہ وجہ تھی جو حضورؐ نے ان جزئیات کو مدون کر کے ان کا (اپنی احادیث کا) مجموعہ امت کو نہ دیا اور نہ ہی خلفائے راشدین نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں خلفائے راشدین کے زمانے میں ان جزئیات میں ردّ و بدل کیا گیا۔"

اور اسی سلسلہ میں دوسری جگہ تحریر کیا تھا کہ "جزئیات غیر متبدل نہیں ہوتیں۔"

مزید وضاحت

"اگر اللہ تعالیٰ نے اصولوں کی جزئیات و تفصیلات خود نہیں بتائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ خدا کی آخری کتاب کے لیے جسے اقوامِ عالم کے لیے ہر ملک اور ہر زمانے میں ابدی ضابطہ حیات بننا تھا، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسے زندگی کے ایسے اصول دینے چاہئیں تھے جو ہر زمانے میں نوع انسان کے لیے راہ نمائی کا کام دے سکیں۔ اور ان کی جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دینا چاہیئے تھا تاکہ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں خود مرتب کریں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے اور ان کی چار دیواری کے اندر مرتب کردہ جزئیات میں حسبِ ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی۔ اسی طرح ثبات و تغیّر کے حسین امتزاج سے کاروان انسانیت زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا۔"

ملوکیت کا علاج

یہی وہ ثبات و تغیّر کا حسین امتزاج ہے کہ جس کے بغیر معاشرہ خلافت کی بجائے ملوکیت میں بدل جاتا ہے۔ جس سے محفوظ رہنے کے لیے علامہ اقبال نے ملّتِ اسلامیہ سے کہا تھا ؎

خلافت برمقام ما گواہی است　　حرام است آنچہ برما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ　　خلافت حفظ ناموس الٰہی است

یعنی امتِ مسلمہ کا صحیح مقام حکومتِ خداوندی ہے۔ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت اس کے نزدیک حرام ہے۔ انسانوں کی حکومت خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو مکر و فریب کا جال اور شعبدہ بازی کا سراب ہوتی ہے۔ ناموس الٰہی کی حفاظت صرف قرآنی حکومت میں ممکن ہے۔

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

اور اے مومنوں سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔
(سورہ النور۔ آیت ۳۱)

آٹھواں باب

عُلماء کی علمی سطح، دانشوروں کی نظر میں

جناب فاروقی صاحب سے انٹرویو

سابقہ صفحات میں کی گئی تمام تر گذارشات کی روشنی میں اب اگر اس چیز کا جائزہ لینا مقصود ہو کہ یہ ماحول ہمارے ہاں کس قسم کے علماء پیدا کرتا ہے تو اس کا اندازہ جناب فاروقی صاحب چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ کے انٹرویو سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے لندن ویک اینڈ ٹیلی ویژن کے نمائندہ کو دیا تھا۔ اور جو ۸ فروری ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد سے شائع ہونے والے اخبار "مسلم" میں شائع ہُوا۔ انٹرویو کے مطالعے سے ہی یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکے گی کہ اقبال کے مردِ مومن حضرت قائدِ اعظم نے جو مذہبی پیشوائیت کی اس قدر مخالفت کی اس کی وجہ جواز کیا تھی ؟

علماء کا پیش کردہ نظریہ :

سوال نمبر ۱ : تشکیلِ مملکت (پاکستان بننے کے بعد) جو مذہبی نظریہ ان علماء نے پیش کیا وہ کس قسم کا تھا اور یہ کیسے لوگ تھے ؟

جواب : جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ قدامت پرست طبقہ تھا جس کا مؤقف اسلام کی اس تعبیر کا مظہر تھا جو پہلی یا دوسری صدی ہجری کے فقہائے اسلام نے مرتب کیا تھا۔ علاوہ ازیں پاکستان میں سنّی اور شیعہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں۔ سُنیوں کے نزدیک فقہ کے چار امام ہیں جن کے وضع کردہ قوانین حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں ان کے برعکس شیعہ حضرات کے نزدیک یہ حیثیت ان کے بارہ اماموں کو حاصل ہے۔ بنیادی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کا مسلک اپنے اپنے فقہا کے پیش کردہ اسلام کی اندھی تقلید تھا۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ ان فقہاء کا زمانہ پہلی یا دوسری صدی ہجری تھا اور جو مسائل اس وقت ان کے پیشِ نظر تھے وہ ہمارے زمانے کے مسائل سے مختلف تھے۔ عرب معاشرہ بنیادی طور پر قبائلی تھا۔ ان کی معیشت گلّہ بانی تھی۔ جب اسلام بیرونِ عرب ممالک پہنچا جن کی معیشت زرعی تھی تو ان کے معاشرہ کے مسائل زیادہ پیچیدہ تھے۔ جب مسلم فقہا کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا، تو انہیں اسلام کی ایسی تعبیر نو کرنی پڑی جو اس جدید معاشرہ کے حسبِ حال ہو۔ ہم اس نظریہ کو آگے بڑھا کر دورِ حاضرہ میں پہنچتے ہیں جہاں کی معیشت صنعتی ہے۔ جس طرح سابقہ دور کے مسلم فقہا نے زرعی معیشت کے سلسلہ میں اسلام کی ایسی تعبیر نو کی تھی جو اس سے ماقبل معاشرہ میں پیش کردہ تعبیر سے مختلف تھی، اب اسی

طرح یہ لازمی ہے کہ دورِ حاضرہ میں صنعتی معیشت کے پیشِ نظر اسلام کی تعبیرِ نو کی جائے۔ کیونکہ زمانے کے مسائل سابقہ دور کے مسائل سے مختلف ہیں لیکن ہمارے علماء کا جمود اور قدامت پرستی کسی تعبیرِ نو کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ وجہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں جو اسلام علماء پیش کرتے ہیں وہ ان کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

کیا تقاضوں کو پورا کیا جا سکے گا

سوال نمبر ۲ : کیا یہاں کے علماء اپنے ملک میں تبدیلی کر کے اسلام کا ایسا قالب پیش کریں گے جو لوگوں کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا کر سکے ؟

جواب : مشکل یہ ہے کہ علماء کی تعلیم قدیم روایات کے تحت ہوئی ہے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے اندر عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے سینے میں کشادہ پیدا کریں۔ یہ سب سے پہلی ضرورت ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کتنے علماء ہیں، جنہوں نے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے اپنی نگاہ میں وسعت اور سینے میں کشادگی پیدا کی ہے!!!

لہٰذا اس ضمن میں پہلا سوال ہی یہ ہے کہ کیا علماء اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کی پیدا کردہ رکاوٹ

سوال نمبر ۳ : کیا آپ بتائیں گے کہ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ علماء کا یہ جمود اور فرقہ وارانہ اختلاف اسلامی مملکت کے قیام کے لیے ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے راستے میں ان کے لیے کس طرح رکاوٹ بنا رہا ؟

جواب : اصل سوال تو ذہنیت اور نقطۂ نظر کا ہے۔ یہ ان علماء کا جمود اور قدامت پرستی ہے جو انہیں سیدھی فرقہ وارانہ سطح پر پہنچا دیتی ہے۔ ایک فرقہ کے علماء کی اسلامی تعبیر دوسرے فرقے کی تعبیر سے مختلف تھی۔ اختلافات دُور کرنے کے لیے عملی تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے اور جمود اور قدامت پرستی عملی تخلیق کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے جو یہ علماء کبھی ایک محاذ پر متفق نہیں ہو سکے۔ وہ گاہے گاہے کسی ہنگامی مقصد کی خاطر یکجا بھی ہو جاتے ہیں لیکن جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں ۱۹۷۷ء کا قومی اتحاد ہمارے سامنے ایک زندہ شہادت ہے۔ (بحوالہ "طلوعِ اسلام" مارچ ۱۹۸۰ء)

علامہ اقبال کی سوچ

اس زبوں حالی کو محسوس کرتے ہوئے بہت عرصہ پہلے علامہ اقبال نے فرمایا تھا :

" ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام یعنی خدا کے عطا کردہ دین کے ساتھ اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں اس کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں اس

مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کردوں جس کی اشاعت رسولِ اکرم صلعم سے ہوئی۔"

(بحوالہ منشی سراج دین کے نام خط ۱۹۱۵ء)

اور اس سے پیشتر علامہ اقبال کا وہ بیان جو پہلے بھی دیا جا چکا ہے ایک بار پھر سامنے لایئے۔ یعنی یہ کہ:

"تمہارے دین کی عظیم الشان بلند نظری ملاؤں، فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے .... روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لیے تو شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائیں۔" (۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء)

آغا شورش کاشمیریؒ اور علماء کرام

آغا شورش کاشمیری کی شعلہ بیانی سے کون واقف نہیں۔ مرحوم نے علماء کرام کی اس ذہنی کیفیت اور علمی قابلیت کے پیشِ نظر اپنے مؤقر جریدہ "چٹان" کا ایک اداریہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۹ء کو سپردِ قلم کیا جو لاہور میں ہونے والی سیرت کانفرنسوں کے سلسلہ میں تھا۔ آپ نے لکھا تھا:

سیرت کی محفلیں علماء اور سامعین

"ابھی پچھلے دنوں لاہور میں دو تین کانفرنسیں ہوئی ہیں ان میں بعض قابلِ احترام اور جید علماء شریک ہوئے۔ سب نے اپنے موضوع پر نہایت مرصع تقریریں کیں۔ ان کانفرنسوں میں ہم نے تین باتیں پائیں۔

۱۔ پہلی بات ہر کا اجلاس (سامعین) کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کے موروثی پیروکار ہیں اور تذکرہ سیرت کی ان محفلوں کو ثواب دارین پر محمول کرتے ہیں لیکن اسلام کا معاشرہ سے مطالبہ کیا ہے اس سے قطعاً واقف نہیں ہیں۔

۲۔ دوسری بات اکثر تقریریں وعظ کی حیثیت رکھتی تھیں ان کا عصرِ حاضر اور اسلام دعوتِ رسالت اور عصری سیاست کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عام خیال یہ ہے اور ہے بھی بڑی حد تک

قرین صداقت کہ ہمارے یہ علماء "قرآن ہر زمانے میں بولتا ہے" کی سچائی سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ یہ علماء سے کہیں بڑھ کر اسلام کے داستان گو ہیں ان کا بلکہ کسی بھی روایتی عالمِ دین کا مسلمانوں پر کوئی اجتماعی اثر نہیں۔

۳- اور تیسری بات یہ ہے کہ شخصی احترام کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان علماء کی ننانوے فیصد اکثریت ایسی ہے کہ ہمارے دل میں ان کے لیے ذہنی احترام مفقود ہے۔ ہم اسلام سے براہِ راست آگاہ نہ ہوتے تو ان بزرگوں کا وجود ہی اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ نئی نسلیں اسلام سے کٹ رہی ہیں۔ ان کی وجہ خود ہمارے علماء (دارثانِ منبر و محراب) کا وجود ہے اور وہ نسل جو پچھلے دس پندرہ برس میں جوان ہوئی ہے اس کی ایک خاصی تعداد بے زار ہے اور اور ایک غالب تعداد ہے کہ تاریخ اسلام میں ان بزرگوں کا وجود گورکن سے زیادہ کوئی مرتبہ یا معنی نہیں رکھتا۔"

ارشاد احمد حقانی صاحب اور علماء کرام

جناب ارشاد احمد حقانی صاحب مشہور کالم نویس جنگ لاہور کے کہنے کے مطابق:

"ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر اہلِ مذہب جدید رجحانات سے آگاہ نہیں۔ ان کی دلچسپیاں خاص قسم کے مسائل اور مباحث تک محدود ہیں۔"

پھر مزید فرمایا: "یہ چیز تعلیم یافتہ لوگوں میں مذہب کے بارے میں ایک منفی ردِ عمل اُبھار رہی ہے جس کے تدارک کی فکر کی جانی چاہیئے۔ المیہ یہ ہے کہ چیزوں کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ جاری کرنے والوں کی غالب اکثریت روحِ اسلام سے آگاہ ہے نہ روحِ عصر سے۔"

(بحوالہ جنگ ۷ جولائی ۱۹۸۳ء)

۱۹۸۳ء کے بعد ۱۹۸۴ء میں اسی حقیقت کو جناب حقانی صاحب نے اس انداز سے فرمایا کہ:

"ایک زمانہ تھا کہ پورے برصغیر میں ایک دو افراد کو علامہ کہا جاتا تھا جیسے علامہ مشرقی اور علامہ اقبال۔ لیکن آج ہر دوسرا مولوی علامہ ہے۔ جس نے چند شعر یاد کر لیے اور تاریخ اسلام کے دو چار واقعات ان کی صحیح معنویت سمجھے بغیر رٹ لیے وہ علامہ بن جاتا ہے۔ اس کی جلسہ گاہ میں آمد پر نعرے لگتے ہیں۔ اس کے تقریر کے لیے کھڑے ہونے پر نعرے گونجتے ہیں۔ اس کی تقریر کے دوران داد ملتی ہے۔ اور بات جس قدر احمقانہ کی جائے اسی قدر زیادہ پُرجوش پذیرائی

ہوتی ہے۔ دین کا ایک مضحکہ خیز اور انتہائی مسخ شدہ تصور ایسے جاہل علاّموں کے ذریعہ نیم خواندہ عوام میں پھیلایا جا رہا ہے اور یہ کاروبار ایک جگہ نہیں سارے ملک میں ہو رہا ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۴ء)

مسٹر جسٹس قدیر الدین احمد کا بیان

جناب وارث میر صاحب جو ہمارے ہاں ایک نام ور صحافی اور پروفیسر ہیں اپنے ایک قسط وار مضمون "عورت اور پردہ" میں جناب مسٹر جسٹس قدیر الدین کے حوالے سے روزنامہ جنگ لاہور میں مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۸۵ء کو تحریر کرتے ہیں کہ :

"جسٹس قدیر الدین نے نہایت قابلِ اعتراض" اور "تکلیف دہ" باتیں کی ہیں ذرا سن ہی لیجئے۔ "اب علوم اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ ان (مذہبی) علماء کا علم و فضل بہت ہی محدود اور نامکمل نظر آ رہا ہے۔ وہ علمِ اقتصادیات کے ماہر نہیں کہ معاشی مسائل پر حکم لگا سکیں۔ فنِ حرب کے ماہر نہیں کہ جنگ اور صلح کے متعلق رائے دے سکیں۔ علمِ سیاسیات کے ماہر نہیں کہ طرزِ حکومت اور طریقۂ انتظام ملکی میں دخل دے سکیں۔ تاریخ، جغرافیہ، نفسیات، عمرانیات، البشریات، تاریخ ادیان عالم، جدید فلسفہ، جدید منطق، جدید سائنس اور فلکیات ان کے نصاب میں داخل نہیں بلکہ تاریخ تفسیر اور تاریخ فقہ بھی ان کے نصاب میں شامل نہیں ہے۔ ان علوم اور مسائل کو وہ تعلیم یافتہ اصحاب جن کی گنتی علماء میں نہیں ہے، اکثر علماء سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس لیے جب علمائے دین تحکمانہ انداز سے اپنے فیصلے صادر کرتے ہیں تو ان کو سن کر جدید تعلیم یافتہ لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں اور وہ سارے مسائل جن پر صحیح اجتہاد درکار ہے، مسلمانی در کتاب کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ پھر جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر خفگی اور غصّہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کو مغرب زدہ، راحت طلب، نفس کا غلام اور بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ملک میں قدیم طرزِ تعلیم کی خصوصیت یہی رہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بات کو تسلیم نہ کرے تو اس پر غصّہ کیا جائے۔ تکلیف دہ سوالات کرنے والے کا منہ بند کر دیا جائے۔ ایسے سوالات کو اس طرح طے کر دیا جائے کہ ان کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ نہ سکے۔"

(دورِ حاضر اور اجتہاد)

علماء کی علمی سطح کے متعلق اس حقیقتِ حال کو جاننے کے بعد مندرجہ ذیل خبر ملاحظہ فرمائیں :

"علماء کا مطالبہ اور ان کا الٹی میٹم

ایک پریس ریلیز کے مطابق مجلس عمل تحفظِ حقوق علماءِ کرام و ملازمین اوقاف پنجاب کے صدر قاضی محمد زمان خان کی اپیل پر ایک ہزار سے زائد مساجد میں کئی قرار دادیں منظور کی گئیں (جن کے تحت) صدر، وزیرِ اعظم، وفاقی وزیرِ خزانہ اور صوبائی وزیرِ اعلیٰ سے مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ بجٹ میں محکمہ اوقاف کے علماء کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ علمائے دین کی کم از کم تنخواہ ڈھائی ہزار کی جائے۔ رہائشی مسائل حل کیے جائیں، موٹر سائیکل ایڈوانس اور مکان ایڈوانس کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ قرارداد میں کہا گیا کہ اگر علماء کے ساتھ زیادتیاں جاری رہیں تو وہ عید کے بعد نماز جنازہ نہیں پڑھائیں گے اور بچہ پیدا ہونے پر کان میں اذان نہیں دیں گے اور نہ ہی کسی کا نکاح پڑھائیں گے۔" (بحوالہ روزنامہ امروز لاہور مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۸۶ء)

ہمارا خیال ہے کہ اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر ہمیں آگے چلنا چاہیئے۔

عدالت کی تحقیقاتی رپورٹ

فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء کے سلسلہ میں تحقیقاتی عدالت کی طرف سے شائع کردہ رپورٹ کے مطابق دورانِ تفتیش عدالت نے پاکستان کے نو جید علماء کرام جن میں (۱) مولانا ابو الحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان (۲) مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان (۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی۔ (۴) غازی سراج الدین منیر صاحب (۵) مفتی محمد ادریس صاحب جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد (۶) حافظ کفایت حسین صاحب ادارہ تحفظ حقوق شیعہ (۷) مولانا عبدالماجد بدایونی صدر جمعیت العلمائے پاکستان (۸) مولانا محمد علی کاندھلوی دارالشہابیہ سیالکوٹ (۹) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے پوچھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟

چنانچہ ان تمام حضرات کی طرف سے جوابات سننے پر عدالتِ عالیہ نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ "ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں، پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی کوئی ضرورت ہے۔ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلمان" کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالمِ دین کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی کی

تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔" (بحوالہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء)

"مسلمان کی تعریف" کے ہی سلسلہ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کالم روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۸۴ء میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"مجھے یاد ہے کہ لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی نے علماء سے مسلمان کی تعریف دریافت کی تو علماء نے آپس میں مشورہ کے بعد کہا تھا کہ "ہمیں اس کے لیے کچھ مہلت دیجئے۔" (تو جسٹس موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ) آپ کو ڈیڑھ ہزار سال کی مہلت مل چکی ہے اس سے زیادہ کی مہلت دینا اس عدالت کے اختیار میں نہیں۔"

اگر دیکھا جائے تو جو کچھ اس ایک فقرہ میں کہہ دیا گیا ہے، اسے ضخیم سے ضخیم کتاب میں بھی اس خوب صورتی سے نہیں کہا جا سکتا۔

ملیچھوں کے سے سلوک پر بھی اعتراض نہیں

اسی عدالت نے جناب مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان سے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ "اگر ہندو اپنے نظامِ حکومت میں منوشاستر کے تحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کرے تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟" تو اِن کا جواب تھا "جی نہیں۔"

اور یہی سوال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا "یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصّہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے۔" (ایضاً)

اور یہی جواب میاں طفیل صاحب کالعدم جماعت اسلامی کے امیر کا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

شاید اسی صورت حال کو قائم رکھنے کے لیے جناب مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ "مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد ہے وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔"

(بحوالہ "سیاسی کشمکش۔ حصّہ سوم۔ صفحہ ۹۳)

میرا خیال ہے کہ عدالتِ عالیہ میں دیئے گئے اس بیان کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی کہ ہماری زبوں حالی، فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی اصل وجہ کیا ہے اور ملّتِ اسلامیہ کی یکجہتی میں کون لوگ حائل ہیں۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا کِس طرح تیرا جوہرِ ادراک
کِس طرح ہُوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم تیرے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمیٔ افکار نے اندیشۂ بے باک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

نواں باب

مذہب اور دین میں فرق

یہ دیکھنے کے لیے کہ ہامانیت (مذہبی پیشوائیت) کا تراشیدہ مذہب دینِ خداوندی کے مقابلے میں انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے، اس کا اندازہ اس تقابل سے لگایا جاسکتا ہے جو ماہنامہ "طلوعِ اسلام" لاہور نے جون ۱۹۷۹ء کے شمارہ میں پیش کیا تھا اور وہ یہ کہ:

تقابلی جائزہ

مذہب	دین
۱۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	۱۔ دین اجتماعی نظامِ زندگی و خارجی حقیقت ہے۔
۲۔ مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے	۲۔ دین میں معاشرہ کا انداز و آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
۳۔ مذہب میں ہر فرد کا منتہا اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	۳۔ دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
۴۔ مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جاسکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	۴۔ دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
۵۔ مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔	۵۔ دین انسان کو علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب ہے۔
۶۔ مذہب عقل کے دیے گل کرتا ہے کہ اس کا چراغ نہ جلے۔	۶۔ دین عقل کے دیے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔
۷۔ مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔	۷۔ دین اپنے ہر دعوے کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

۸۔ مذہب لوگوں کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

۹۔ مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے آنکھیں بند کیے پامال راستوں پر چلتے رہو۔

۱۰۔ مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کیے چلا جاتا ہے اِس لیے مذہب ہر زمانے میں نئے نئے بُت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔

۱۱۔ مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے

۱۲۔ مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔

۱۳۔ مذہب مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

۱۴۔ مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنت کا وعدہ دیتا ہے

۱۵۔ مذہب کمزوروں، ناتوانوں، مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔

۱۶۔ مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دکھاتا ہے اور انسان

۸۔ دین انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

۹۔ دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن حرام است

۱۱۔ دین اِنہی حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی سطح کو بلند کرتا ہے۔ دین تیشۂ ابراہیمی سے ہر قدیم اور جدید بُت کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

۱۱۔ دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت و بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

۱۲۔ دین اسے ایک خدا کے قوانین کا اطاعت گزار بنا کر دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

۱۳۔ دین مادہ کی تسخیر سے انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

۱۴۔ اور دین اِس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنت حاصل کراتا ہے اور وہاں بھی۔

۱۵۔ دین ظلم و استبداد، سلب و نہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانین خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے

۱۶۔ دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان

ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

۱۷- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

۱۸- مذہب کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے

۱۹- مذہب موت کی سسکیاں ہیں

۲۰- مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کرتا ہے۔

۲۱- مذہب انسان کی موت ہے۔

ی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ نامساعد حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎ شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

۱۷- دین اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظام باطل پر غالب کرنے کی عبادت کو غایت بتاتا ہے

۱۸- دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ (۷/۳۲)

۱۹- دین زندگی کے قہقہے ہیں۔

۲۰- دین قبرستانوں میں صور اسرافیل پھونک کر مردوں کو حیات تازہ عطا کر دیتا ہے۔

۲۱- دین ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

مذہب کا مدار لالچ اور خوف پر ہوتا ہے

مذہب اور دین کے سلسلہ میں اس پیش کیے جانے والے تقابل پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہمارے ہاں اکثر (کتاب و حکمت کے بلند فلسفہ کے تحت) دین خداوندی کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کی اہمیت و افادیت کو علیٰ وجہ بصیرت دل کی گہرائیوں میں جاگزیں کرایا ہی نہیں جاتا بلکہ اس کے برعکس مذہبی دنیا کا تمام کاروبارِ حیات یا تو لالچ پر ہوتا ہے یا خوف پر اور پھر یہ کہ مذہبی دنیا کے کسی شعبہ میں بھی بچوں کی نفسیات کے نام کی کوئی شے ہوتی ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ملت کے ان شاہین بچوں کے خوبصورت عزائم کے چراغ زندگی بھر روشن نہیں ہوتے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر دین کی پُرنور وادیوں پر گامزن ہونے کی بجائے مذہب کے تاریک راستوں پر ہی ٹھوکریں کھاتے گور سے لحد تک جا پہنچتے ہیں۔

راقم ان بیان کردہ حقائق کی مزید وضاحت کے لیے اپنے ایک محسن جناب
--- کے چند ایک اوراق (ان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ) پیش کر رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ قارئین اِن دو چار صفحات پر پھیلی ہوئی اِس سچّی اور سچّی آپ بیتی کے چھوٹے فقرات کے ایک ایک لفظ کی گہرائی پر غور کریں گے اور وہ اِس لیے کہ شاید اس طرح حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ اقتباسات ہماری کوئی مدد کر سکیں۔ اور ہم علّتِ مرض کو جان لیں۔

ایک سبق آموز حقیقی داستان

چنانچہ تحریر ہے کہ :

" دادا جی چونکہ مذہبی پیشوا تھے اور والد بھی قاضی ہوتے تھے، اِس حوالے سے مجھے بھی انہوں نے ابتدا ہی سے مذہبی تعلیم دینا اور دلوانا شروع کی۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے مجھے -- کی قصائیوں والی مسجد میں ایک نابینے حافظ جی کے سپرد کر دیا۔ یہ ایک درسگاہ تھی اور اِس درس گاہ میں لڑکے اور لڑکیاں، بڑے اور چھوٹے، اکٹھے قرآن پڑھا کرتے، ان میں سے اکثر حفظ کرتے۔ صبح سویرے طلوعِ آفتاب سے لے کر شام کی اذان تک پڑھائی ہوتی۔ چھٹی یا فرصت کا یہاں کوئی تصور نہ تھا — جہاں حافظ جی تندہی اور محنت سے پڑھانا جانتے وہاں پٹائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک کو بلا امتیاز و درجہ و عمر بلاناغہ روزانہ مارتے اور اس قدر مارتے کہ الامان الحفیظ۔ چیخ و پکار دُور دُور تک سُنائی دیتی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اُن کے من میں ایک جوش سا اُبھرتا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور قطار در قطار، یکے بعد دیگرے، قدم بہ قدم، سب کو پیٹتے چلے جاتے۔ کہرام مچ جاتا۔ کوئی پُرسانِ حال نہ ہوتا۔ صحت مند ہاتھوں کے علاوہ کیکر کے ڈنڈے استعمال کرتے جو روزانہ بن کر آتے اور ٹوٹتے چلے جاتے۔ میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ داخل ہوئی تھی لیکن تاب نہ لا سکی اور چند ہی ماہ بعد گھر پر آ گئی۔ میرا چار سال کا عرصہ اس درس گاہ میں گزرا۔ لیکن ایک دن بھی ایسا نہ تھا جو میرے لیے قیامت سے کم ہو۔ جسم کا کوئی حصّہ بچا نہیں تھا جو چھلنی نہ ہوا ہو۔ کوئی جگہ نہ تھی جہاں ورم نہ آیا ہو۔ اِدھر گھر پر والد کی سخت گیری اور مار کٹائی میرے لیے اور بھی اذیّت ناک عذاب تھی۔ میری ذہانت تسلیم شدہ تھی اور مجھ میں محنت کی کمی بھی نہ تھی لیکن اس سے کیا

فائدہ؟ حافظ جی کے درس کی یہ خصوصیت تھی، یہ رائج تھا، اغلباً ان کے عقائد میں سے تھا، کہ ایک ایک حرف پر اور ایک ایک لفظ پر مارا جائے اور مارا بھی جائے اس زور اور گرمجوشی سے کہ طالب علم میں سکت باقی نہ رہے۔ اذیت رسانی میں یہ درس گاہ مشہور تھی اور یہ بھی مشہور تھا کہ یہاں کے پڑھے ہوئے حافظ پکّے حافظ ہوتے ہیں۔ پکّے اور کچّے کا معیار کیا تھا اور اس سعادت اور محنت کے آئندہ زندگی پر کیا منفی اثرات مرتب ہونے تھے، نہ ہی لکھوں تو بہتر رہے گا۔ وہ گھڑیاں، وہ لمحات آج بھی اس عمر میں جب یاد آتے ہیں تو میرا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ یہی نہیں تھا، ان کے اس تشدد اور ان کے اس جذبۂ انتقام سے جو حافظ جی نے روا رکھا، مجھے اور کن دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑا، اس کی روداد بڑی ہی المناک اور رقت آمیز ہے، اس مذہبی تعلیم، جس کا میرے اپنے خیال میں، کتابِ حکمت کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، کے دوران میں دو دفعہ گھر سے بھاگا، کیا ہوگی عمر میری؟ صرف ۷، اور ۸ سال۔ یہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔

(چنانچہ) ایک دن درسگاہ جانے کی بجائے باہر کی طرف میں بھاگ کھڑا ہوا۔ برہنہ پاؤں بھاگتا ہی چلا گیا۔ پھلروان جانے والی کچی سڑک تھی۔ چھ سات میل گیا ہوں گا کہ والد پیچھے سے بائیسکل لیے پہنچ گیا۔ والد جو غصّے سے مدہوش تھا میری دہائی کیا سنتا؟ مجھے پکڑ لیا اور سائیکل کے آگے گھر کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ ایک چچا، جسے میں ماموں کہا کرتا تھا، میری ماں کے کہنے پر بھاگتے ہوئے آملا۔ جان بچ گئی اور میرا والد پھر مجھے اسی درس گاہ میں اسی روز چھوڑ آیا۔ گھر والوں نے اور حافظ جی نے مزید پابندیاں عائد کر دیں اور حرکت و آزادی کے تمام ذرائع میرے لیے محدود کر دیے۔ خوب اندازِ ستم تھا۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میں دوبارہ گھر سے چلا گیا، ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ بے چینی کے عالم میں، بجھے ہوئے دل کے ساتھ، چلا جا رہا تھا۔ کبھی پیدل، کبھی ریل گاڑی میں، کبھی اس طرف اور کبھی اس رخ، حیران و سرگرداں، ایک دن تو چلتے چلتے میں نڈھال ہو گیا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ جا رہا تھا کہ شام ہونے کو آئی، بھوک اور پیاس سے بری حالت تھی۔ ایک پھاٹک والے حمیدہ اوصاف شخص اور اس کی بیوی نے مجھے سہارا دیا۔ دال پکی تھی۔ اپنے دو بچوں کے ساتھ مجھے بھی کھانے کو روٹی دی۔ جان میں میرے جان آئی۔ چاند رات تھی گذر گئی۔ صبح تنہائی میں پھر چل دیا۔ وہ نیک خاتون مجھے اپنے پاس رکھتی۔ کھانے

کو بھی دیتی اور کفالت بھی کرتی، لیکن وہ مجبور تھی، اسی معاشرے کے ہاتھوں جس کا کہ میں ایک فرد تھا۔ اُس کھانے کا ذائقہ آج بھی میرے منہ میں اُسی طرح ہے جس طرح ۴۹ سال پہلے تھا۔ سمندر کا کنارا گواہ ہے کہ میں پھر کہاں پہنچا؟ کتنا لمبا سفر طے کیا؟ کس طرح کیا؟ ایک بدبخت نے تو سمندر کے پانی میں مجھے غوطے تک دیے۔ میں ڈوب گیا ہوتا اگر میرا خالق معاونت کے اسباب پیدا نہ کرتا۔ بہر حال گاڑیوں کی لاتعداد اور ان گنت پٹڑیوں کے ساتھ ایک مسجد تھی جو میرے لیے پناہ گاہ بنی۔ میں اُس کے سائبان میں وہاں رہا۔ املی کا درخت لگا تھا اُس مسجد کے صحن میں۔ ڈیڑھ سپارہ قرآن کا میں نے از خود حفظ کر لیا۔ کوئی غلط چیز یہاں متصادم نہ تھی۔ جبر نہ تھا، شفیق تھے سارے لوگ۔ اچھی سیرت اور اچھی خصلت کے سبھی دکھائی دیتے۔ انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی طرح رکھا۔ دل میرا بہلا رہا ——

پھر ایک دن بے قراری کے عالم میں اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ ریل گاڑی میں بیٹھا جا رہا تھا کہ ایک صاحبِ دل نے پوچھا کہ لڑکے کدھر جا رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ گھر کو، بھیرہ کی طرف۔ اُس نے کہا کہ یہ اور گاڑی ہے، تم اگلے سٹیشن اُتر جاؤ اور دوسری گاڑی میں بیٹھو —— سفر کرتا رہا کہ ایک وقت آیا میں لاہور پہنچ گیا۔ ریلوے سٹیشن پر ہی ایک شخص نے مجھے پکڑ لیا اور یتیم خانہ میں جا کر داخل کروا دیا۔ اچھا دور تھا کہ یتیم خانہ پہنچ گیا وگرنہ آج کا وقت ہوتا تو میں یہاں نہ ہوتا اب تک میری ہڈیاں بھی کوئی چبا گیا ہوتا۔ یتیم خانہ کی زندگی کا کیا عرض کروں۔ ایک ماتم خانہ تھا۔ لال پیلی آنکھیں ہر کوئی دکھاتا دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر گلی گلی میں مانگتا پھرا۔ کچھ اس طرح کی صدا تھی جو ہم کم سن بچے لگاتے:

"ماداں والیو مائیو سُن لو ساڈی فریاد۔ ماں پیو مر گئے ساڈے رہیا کوئی نہ کول۔۔"

اور ہماری اس پُرسوز صدا پر غریب اور نادار عورتیں تھیں جو ترس کھا کر کچھ نہ کچھ بخشش کر دیتیں۔ لنگر خانے سے روٹی نصیب ہو جایا کرتی۔ فرسودہ اور گندا ماحول تو تھا ہی۔ لیکن محفوظ تھے۔ بہبود اطفال ہی کا شاید نتیجہ تھا کہ انتظامیہ نے چند ہفتوں کے اندر ہی میرے گھر والوں کو اطلاع دی اور میرا والد مجھے لے گیا۔ میری عدم موجودگی میں میرے گھر والوں پر جو کچھ بیتی، مجھے اُس کا علم نہیں۔ اتنا ضرور پتہ ہے کہ جب میں اُن سے ملا تو وہ بھی روتے تھے۔ میرا والد اپنے عزم کا راسخ نکلا اور اُس نے مجھے اُسی درسگاہ

میں اُسی حافظ جی کے پاس پھر جا بٹھا دیا۔"

" آخر ایک دن سحر طلوع ہوئی اور میرے والد کی تمنائیں بر آئیں اور میں حافظِ قرآن ہو گیا ـــــ گیارہ سال کی عمر تھی کہ میں نے تراویح پڑھائی۔ اور اس کے بعد متعدد بار دوسری مساجد میں بطور سامع بھی گیا۔ اُن دِنوں حافظوں کی نفری کچھ اس طرح کی تھی کہ اگر نمازیوں یا مقتدیوں کی تین صفیں ہوتیں تو ایک صف حافظوں کی لازمی ہوتی۔ اتنے حافظ کرتے کیا؟ تراویح پڑھانے والے حافظ کو ٹوکتے، متشابہ میں ڈالتے اور اس طرح کے حربے استعمال کرتے کہ وہ مشتعل ہو اور پڑھتے پڑھتے رُک جائے۔ ناک میں اُس کے دَم آ جائے اور وہ اپنا مصلّٰے بالآخر چھوڑ دے۔ فی الواقع یہ ہمیں ثابت کرنا ہوتا تھا کہ اس حافظ کو قرآن زبانی پڑھنا نہیں آتا۔ اس ضمن میں آئے دن فسادات اور جھگڑے ہوتے اور رمضان ختم ہونے تک بدستور رہتے۔"

" جہاں لڑکپن کی اور باتیں مجھے یاد ہیں، وہاں یہ بات بھی مجھ سے چھپی نہیں کہ میرے رفقاء، میرے استاد بھائی، جو رات کو تراویح کی نماز پڑھاتے وہ روزہ نہیں رکھتے تھے۔ گیارہ سال میں نے مختلف مساجد میں قرآن سُنایا ہے اور اس عرصے میں ہمیشہ یہی دیکھا ہے۔ بھیرہ کی ہی بات نہیں فیصل آباد، ساہیوال، امرتسر اور لاہور ہر جگہ یہی کیفیت تھی کیونکہ میں تراویح پڑھانے کے سلسلے میں ان اصحاب میں رہتا اور دن رات حجروں اور مسجدوں میں گذارتا رہا ہوں۔ عمر رسیدہ اور شریف النفس لوگ یہ جانتے بھی ہوتے مگر مذہبی عقیدت کے پیشِ نظر وہ ان تمام باتوں کی پردہ پوشی کرتے۔"

" پیسوں کے ملنے کا لالچ، اچھا کھانے کی توقعات، کپڑے ملنے کی اُمید، وقتی عزّت، سہل انگاری، یہ تھیں وہ راہیں جن پر یہ لوگ گامزن تھے۔ عظمت ان سے بہت دُور تھی۔"

" میں اپنے ہمجولی حافظوں کی رفاقت میں اپنے استاد حافظ جی کی زیرِ نگرانی، ایک ماہ میں کئی کئی بار لوگوں کے گھروں میں قرآن کا ختم کرنے جاتا... میں بھی دوسرے تمام ساتھیوں کی طرح سپارہ ہاتھ میں کھلا رکھتا۔ کچھ آیات ہم اونچا پڑھتے پھر چُپ سادھ کر ورق اُلٹ دیتے اور اس طرح جلدی جلدی اپنے حصّے کی تلاوت ختم کر دیتے۔ عام طور پر ایک گھنٹے میں ختمِ قرآن ہونے کے ساتھ تمام مذہبی رسومات پوری ہو جاتیں ـــ حافظ جی کو عوضانے کے طور پر پیسے مل جاتے اور ہم بغیر نقدی واپس اُن کے ساتھ آ جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ختم

کرانے والے ہمیں کھانا کھلا دیتے۔ چائے تو اتنی چلی نہیں تھی۔ مرنے والوں کی قبروں پر بھی ہم پڑھنے جاتے اور مزاروں اور خانقاہوں کے سرہانے بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتے اور رقم وصول کرنے کے ساتھ ثواب کماتے۔ جتنے پیسے ملتے، حافظ جی ہی لے جاتے۔ یہی کام بعد میں دوسرے ملاؤں کی بہنوائی میں، میں نے اپنے والد کے ساتھ بھی کئی دفعہ کیا۔ مرنے والوں کو ثواب بھی پہنچایا اور رقم بھی لی۔ قرآن مجید کا نزول کس واسطے ہوا؟ کیا لکھا تھا؟ احکاماتِ خداوندی پر کس طرح عملاً کاربند ہونا تھا؟ — کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور اگر کوئی جانتا تھا تو وہ سچی بات بتاتا نہیں تھا۔ بتاتا تو اس کی اپنی روزی اور اس کے کاروبار کا بھانڈہ پھوٹ جاتا۔ قبروں اور مزاروں سے ہٹ کر قُل پڑھے جاتے اور اس میں پوری بستی کے ملاؤں اور پیش اماموں کو مدعو کیا جاتا۔ یہ اپنے ساتھ اپنی اپنی مسجدوں کے شاگردوں کو لے آتے۔ خوب گہما گہمی میں قرآن کی تلاوت ہوتی۔ میں ایسی مجالس اور ختموں اور قلوں میں ہمیشہ شمولیت کرتا۔ مجھے خود تو کیا جانا ہوتا، لے جایا جاتا تھا۔ کبھی اپنے معزز استاد جی کی طرف سے اور کبھی والد کے کہنے پر۔ پڑھتے تو اللہ کا کلام، لیکن ہم پیسے کے متمنی پڑھنے والوں کی حیثیت ہوتی بالکل بھکاریوں جیسی۔ منگتے تو حوصلہ کر کے مانگ لیتے ہوں گے مگر ہم میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ کاسہ آگے کر دیں۔ ختم ہو چکتا تو ہماری نگاہیں جو ظاہراً جھکی ہوئی ہوتیں، شعوری طور پر پیسے بانٹنے والوں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ جتنا بڑا سرمایہ دار، غریبوں کا خون چوسنے والا ہوتا، اتنا ہی بڑا ختم اُس کا کرایا جاتا۔ پیسے تقسیم کرنے والے بڑی تمکنت سے اُٹھتے۔ دو یا تین کی ٹولی ہوتی۔ ایک سکوں اور روپوں کا بھرا ہوا رومال اُٹھائے ہوئے ہوتا اور دوسرا نکال نکال کر دیے جاتا۔ جوں جوں وہ پاس آتے دکھائی دیتے، ہماری نظریں، اپنی ہی گود میں، زمین کی طرف لگتی چلی جاتیں اور دونوں ہاتھ جھولی میں اندر ہی کی طرف بندھے رہتے۔ مجال نہیں ہوتی تھی کہ نظر اوپر کی طرف اُٹھ جائے۔ اُوپر دیکھنے میں حرج تو کوئی نہیں تھا، لیکن دینے والے کی نظر میں بدنمائی ہوتی اور وہ بُرا مانتے، بداخلاقی تصور ہوتی قرآن اُٹھانے والے اور یہ پستی؟ قرآن پڑھا گیا ہوتا تو یہ نہ ہوتا۔ وہ دو پیسے یا ایک آنہ جھولی کے اندر ہی، میرے جیسے اور حافظِ قرآن بچوں کے ساتھ، میرے ہاتھ میں تھما دیتے اُن کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہی میں دیکھ پاتا کہ کیا دے گئے۔ ممبروں کے مدعی اور مسند نشین پیش امام جو مسجدوں کے خطیب اور واعظ ہوتے کو ایک روپیہ فی مسجد

مِل جاتا۔ اِس ایک روپے کا ذکر مذہبی محفلوں میں ہوتا کہ اب کے بڑی عزّت افزائی ہوئی اور کمال کر دیا فلاں خواجہ صاحب نے یا فلاں شیخ نے یا فلاں ملک نے۔ وہ دو پیسے یا ایک آنہ جو مجھے مِلتا، بڑی احتیاط سے مَیں گھر لاتا اور ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ جتنے زیادہ مرتے، جتنے زیادہ ختم ہوتے، اتنے ہی زیادہ سکوّں کی فراوانی ہمارے گھر بھی ہوتی۔ ہمارے گھر کا ماحول بھی خوشگوار ہو جاتا اور خرچنے کو بھی ایک آدھ پیسہ زیادہ مِل جاتا۔"

اس کے بعد جناب حافظ صاحب اپنی کتابِ زندگی کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ میرا والد مدرسے کی ملازمت کے علاوہ مسجد کی امامت کرتا تھا، اور اس طرح امامت کے عوضانے میں اسے ہر گھر سے شام کو روٹی مِلتی، اُسی طرح جس طرح اُس وقت کے سبھی مُلّاؤں کو ملتی۔"

"مَیں نے بھی جب سے ہوش سنبھالا اور جب تک بھیرہ رہا مقتدیوں کے ہاں سے ایک وقت کی روٹی لاتا رہا۔ تمام مسجدوں کے تمام مُلّا جی ٹوکری اُٹھا کر گھر گھر مانگنے جاتے لیکن مَیں بڑا سا رومال لے کر جایا کرتا۔ اس طرح کی روٹی لے آنا معیوب تو تھا لیکن معیوب سمجھا نہیں جاتا تھا۔ لینے والے بھی اور دینے والے بھی اسے باعزّت خیال کرتے۔ حالانکہ عزّت اور شرف کی قطعاً کوئی بات نہ تھی۔ کچھ بھی تھا لیکن دینے والے اصحاب کے مرے ہوئے عزیزوں اور رشتہ داروں کو، اُن کے اعتقادات کے مطابق یہ روٹی مِل جاتی اور اس کے دینے والے کو کثیر ثواب بھی مِل جاتا۔ لینے والے اصحاب کا تو پیٹ اُسی سے پلتا۔"

روٹی کی یہ محتاجی اور پھر اس قسم کی دستنگری شعوری اور غیر شعوری طور پر معصوم ذہنوں پر کس قسم کے اثرات مرتّب کرتی ہے اور پھر اس محرومی اور اس عمل سے — اندر کا انسان چہروں کی شگفتگی — جرأت و بے باکی کی نعمت سے کس حد تک محروم ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ اسی سوانح حیات کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے۔ لکھتے ہیں کہ:

"شام کی اذان کے ساتھ ہی دس بارہ سال کی ایک لڑکی بڑی خاموشی سے، بڑی سہمی ہوئی ہمارے گھر کے صحن میں آ کھڑی ہوتی اور اپنی دھیمی آواز میں ڈوڈی روڑہ اچیلت خیر یہ اس کم آبادی والے چھوٹے سے محلّے کے مُلّاں جی کی بیٹی تھی جو روزانہ آتی اور ایک روٹی

لے جاتی۔ مجھے اِس لڑکی کو دیکھ کر اپنا سارا کا سارا وقت یاد آجاتا اور وہ لڑکی مجھے یوں لگتی جیسے میری ہی بہن ہو اور غلط ذہنیت کے ہاتھوں مجبور کردی گئی ہو کہ دَر دَر بھیرے اور روٹی کی بھیک مانگے۔ ڈیڑھ سال مَیں اس لڑکی کو روزانہ اسی طرح دیکھتا رہا اور اپنے دل میں کسک محسوس کرتا رہا۔"

"گھر گھر سے ایک ایک دروازے پر جاکر روٹی کا مانگنا اور لے آنا جہاں احساسِ ندامت پیدا کرتا وہاں اس بات کا کھلا اعتراف ہوتا کہ یہ سب محنت نہ کرنے کی وجہ سے تنگی تھی۔"

اِس تمام دردانگیز اور بصیرت افروز داستان بیان کرنے کا مقصد کیا تھا، یہ جاننے کے لیے آخر پر ہمیں پھر اسی سوانح حیات کا ایک اقتباس پیش کرنا ہوگا:

"یہ جو مَیں نے اپنی عمر کی باتیں بتائی ہیں اور دُکھوں اور بے آرامیوں کا ذکر کیا ہے تو اِس کا مطلب اپنی تاریخ کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ ان مصائب کی بنیادی وجہ کیا تھی۔ ناسازگار حالات اور بنیادی خرابیاں جو انسان کے ہاتھوں پیدا کی ہوئی تھیں وہ نہ ہوتیں یا ان کو ہٹا دیا جاتا تو ہمارے اعصاب نہ ٹوٹتے اور ہم اپنی منزل کو اس طرح نہ بھول جاتے۔ اپنی دشواریوں پر مثبت پہلوؤں سے قابو پالینے سے ہماری سیرت بنتی اور تعمیری طور پر زیادہ پھلتے پھولتے۔ غور کرنے سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دُکھی، علالت اور بدنصیبی کی وجہ —

- انسانی عقائد کی پرستاری تھی، رسوم کی پیروی تھی، اور استبداد تھا جو مذہب کے نام پر روا رکھا گیا۔
- دوسرے انسانوں کی غفلت اور اعمال تھے جو قدرتی اسباب کے نام پر اذیت کوش ہوئے۔
- غلط نظام تھا جس کے تحت چلنے پر مجبور کیا گیا۔
- نادانی تھی، فروگذاشتیں تھیں اور وہ غلط قدم تھے جو روشنی اور ضیاء کے ہوتے ہوئے اندھیروں کی طرف اُٹھتے رہے۔"

(یہ عبرتناک داستان حافظ محمد یعقوب صاحب تاجیک کی ہے جو بعد میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہے۔)

آج کا پاکستان

دنیائے اسلام آج پاکستان کو اسلام کے قلعہ کے نام سے پکارتی ہے لیکن اس طویل اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اِس ملک کی شہری آبادی کے علاوہ اس کے ۴۵۰۰۰ ہزار دیہات میں آپ کو کم و بیش

اسی قسم کا مذہب رائج دکھائی دے گا۔
علامہ اقبال نے سچ کہا تھا کہ ؎

کسے خبر کہ کتنے سفینے ڈبو چکی
فقیہہ و صوفی و ملّا کی ناخوش اندیشی

مذہبی ماحول کے پروردہ نوجوانوں کی نفسیاتی حالت

بہر حال اس قسم کے مذہبی ماحول میں پرورش پانے والے نونہالانِ ملت کس قدر احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ نیز ان میں کس کس قسم کے نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں اور پھر مذہب کے ہاتھوں یہ لُٹا ہُوا نوجوان کس کسمپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے دِن پورے کرتا ہے اس کی وضاحت ادارہ طلوعِ اسلام لاہور نے اپنے ہاں جون ۱۹۷۵ء میں کچھ اس طرح کی تھی کہ :

(اس ماحول) " سے نکلنے کے بعد، یہ نوجوان بالعموم مساجد کے امام یا خطیب بن جاتے ہیں اور وہاں بھی ان کی معاش کا دار و مدار، بالواسطہ یا بلاواسطہ، خیرات ہی پر ہوتا ہے۔ حتےٰ کہ جسے اب محکمۂ اوقاف کہا جاتا ہے، وہ بھی خیرات کا سب سے بڑا ادارہ ہے، " وقف " کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے کچھ جائیداد خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لیے وقف کر دی ہو۔ جس شخص کا ذریعہ معاش تخلیقی (CREATIVE) ہو۔ خواہ وہ جُوتے گانٹھنے والا موچی ہو اور خواہ ذہنوں کو جلا دینے والا معلّم و مفکّر۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، لیکن غیر تخلیقی کاموں، (جیسے امامت وغیرہ) کے معاوضہ میں جو کچھ مِلتا ہے وہ خیرات ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے انسانی شخصیّت (PERSONALITY) کے جوہر شرف و اعتماد مَر جاتے ہیں اور اس میں گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے کی وہی للچائی ہوئی نظریں، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان میں اب مستقل محرومی کا احساس بیدار کر دیتی ہیں جس سے ان کے سینے میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اِس آگ کو بجھانے کے لیے ان میں ایک ذہنیت اُبھرتی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں (SADISM) کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے لیے ابھی ہماری زبان میں کوئی موزوں لفظ وضع نہیں کر سکا، مطلب اس سے ہوتا ہے دوسروں کو اذیت پہنچا کر لذّت حاصل کرنا اس کی بہت سی اقسام ہیں۔ لیکن سب سے گھناؤنی شکل وہ ہے جو مذہب کے مقدّس نقاب میں نمودار ہوتی ہے۔ آپ اِن حضرات کے

وعظوں کو سُنیئے۔ ان کا نوّے فیصد سے زیادہ حصّہ، دوسروں پر طعن و تشنیع کے کچوکوں، طنز و تنقید کے تیروں اور تحقیر و تضحیک کے نشتروں اور توہین و تذلیل کے سوفاروں پر مشتمل ہوگا۔ وہ جس طرح اُچھل اُچھل کر دوسروں کو "مقدّس گالیاں" دے رہے ہوں گے۔ اس سے صاف نظر آجائے گا کہ وہ انہیں ذلیل کر کے کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔ وہ اس اذیّت رسائی سے کس درجہ لذّت حاصل کر رہے ہیں اس کو (SADISM) کہا جاتا ہے جو احساسِ کمتری و محرومی کا پیدا کردہ مرض ہوتا ہے۔"

خوف کے پیدا کردہ امراض

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ مذہبی دنیا کا تمام کاروبارِ حیات لالچ پر منحصر ہوتا ہے ہے یا خوف پر جبکہ دین ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس کے باعث یہ خباثت باقی ہی نہیں رہتی کیونکہ دین کے نزدیک خوف تو وہ عذاب ہے کہ جس کے باعث رگِ زندگی کی شریانوں میں دوڑتا ہُوا خون منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علّامہ اقبال نے خوف و حزن کو "ام الخبائث اور قاطع حیات و توحید" قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اسلام نظامِ فطرت میں کرب و اذیّت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ بہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلۂ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے۔ اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا سرچشمہ عطا کرے۔" (آگے چل کر اقبال رح کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر بُرائی (EVIL) کی جڑ خوف ہے۔"

اور اس کے بعد دوسری جگہ رموزِ بیخودی میں فرمایا کہ:

ہر شر پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ — ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زُور و ریا، پیراہنش! — فتنہ را آغوشِ مادر دامنش!

"تمہارے قلب میں جو شر بھی پوشیدہ ہے، اگر غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی اصل، خوف ہے، چاپلوسی، مکاری، کینہ، جھوٹ۔ یہ تمام خباثتیں، خوف سے پرورش پاتی ہیں۔ منافقت اور فریب اس کے پردہ پوش ہوتے ہیں، اور ہر قسم کا فتنہ اس کے دامن میں یوں پرورش پاتا ہے جس طرح طفلِ نوزائیدہ آغوشِ مادر میں۔"

ظہورِ اسلام کے وقت انسانیت کی حالت

اور پھر ظہورِ اسلام کے وقت انسان کے خود ساختہ مذہب کے ہاتھوں انسانیت کی کیا حالت ہو چکی تھی اس کو بیان کرتے ہوئے علامہ بیان کرتے ہیں کہ :

بود انساں، در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندھا در دست و پاؤ گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک پنجیر، صد پنجیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیر کنشت — باجے بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش — بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد — خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

("انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی پرستش کرتے کرتے، اس درجہ پامال اور خستہ حال ہو چکا تھا کہ اس کی اپنی ہستی ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف تو ملوکیت کے استبداد نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ رکھے تھے۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے ہامان اور نظامِ سرمایہ داری کے قارون گدھوں کی طرح صاحبِ تاج و تخت کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے — ایک شکار اور سینکڑوں شکاری — صاحبِ تاج و تخت (بادشاہ) اور مذہبی پیشوائیت کے استحصال کا یہ عالم تھا کہ اس کی کھیتی، خواہ وہ برباد اور ویران ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ وہ اپنا ٹیکس وصول کر کے رہیں گے۔ پادری، اس کی محنت کے پسینے کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر، جنت کا پروانہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ برہمن اس کی پھلواری کا آخری پھول تک نوچ کر لے جاتا تھا اور آتش کدوں کے مغ اس کے کھلیان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔")

ہم نے یہ باور ہی نہ ہونے دیا

بہرحال مذہب اور دین کے مابین بیان کردہ تقابل کی روشنی میں ہمارے لیے کرنے کا کام تو یہ تھا کہ ہم اپنی علّت مرض کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور نوجوان نسل کو اس گرداب سے نکالنے کا کوئی حل پیش کرتے لیکن ہم نے اس کے برعکس ان نونہالوں کو یہی باور کرائے رکھا کہ جن راستوں پر ہم مصروفِ سفر ہیں، یہی راستے جانبِ منزل ہیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ہمیں صدیوں سے اپنے محاسبہ کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آہستہ آہستہ حالت یہ ہوگئی کہ ؎

کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اور پھر احساسِ زیاں کے فقدان کے باعث ہُوا یہ کہ ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خُوب ہُوا

چنانچہ اِس ناخوب کو خُوب تر کرنے اور اِس باطل کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی خاطر مِلّت کو پھر یہ بھی باور نہ ہونے دیا کہ یہ اختیار کردہ نہج زندگی نہ اسلامی ہے نہ جمہوری اور یہ شاید اس لیے نہ ہونے دیا کہ ہم کہیں سنگسار ہی نہ کر دیئے جائیں۔ اصل تو یہ ہے کہ تھیاکریسی اور ملوکیت کی موجودگی میں شکوہِ ملک و دین کے آثار پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

یہ عظیم مقصد صرف اُس وقت حاصل ہوگا جب بقول علاّمہ اقبال کے :

"اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی رُوح کو لے کر آگے بڑھے گی وہ عمر جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریّت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ :

"حسبنا کتاب اللہ" یعنی ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔"

(خطباتِ اقبال۔

خارجی کائنات میں قانون کی حکمرانی

قرآنِ حکیم کی یہی وہ عظمت ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ :

"اس قرآن میں انسان کی راہنمائی کے لیے ویسے ہی اٹل قانون ہیں جیسے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں اور جن کی رُو سے (مثلاً) سورج اور چاند جیسے عظیم کرّے

ایک مقررّہ حساب اور اندازے کے مطابق چل رہے ہیں۔" (۵۵/۴)

" اور زمین پر بڑے بڑے تناور درخت ہوں یا چھوٹے چھوٹے پودے سب اس کے قوانین کے سامنے جُھکے ہوئے ہیں۔ اس قانون کے سامنے جس کی رُو سے اس نے تمام اجرامِ فلکی کو فضا کی پہنائیوں میں اس انداز سے رکھا ہے کہ ان کے باہمی ربط وضبط کے لیے جس توازن کی ضرورت ہے اس میں ذرّہ برابر فرق پیدا نہیں ہونے پاتا۔" (۵۵/۷)

" یہ قرآن انسانوں کو بھی اسی غرض کے لیے دیا گیا ہے کہ ان کے معاشرہ میں باہمی ربط وضبط کے لیے جس توازن کی ضرورت ہے وہ بگڑنے نہ پائے۔" (۵۵/۸)

اِس زبوں حالی کا علاج

کاش ملّتِ اسلامیہ قرآنی ضابطۂ حیات پر عمل پیرا رہتے ہوئے اس کے بیان کردہ حسین ثمرات سے ہمیشہ بہرہ ور رہتی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد مسلمانوں کے درمیان قرآن حکیم کی غیر متبدل اقدار کو باہمی مشاورت سے نافذ کرنے کا سلسلہ ختم ہوگیا اور ان کے درمیان کوئی مرکزی اتھارٹی باقی نہ رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہی اُمّت جو اُمّت واحدہ تھی کئی فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئی اور قرآنی تعلیم کی بجائے انسانوں کی مُرتّب کردہ مختلف فقہیں رواج پاگئیں اور دین و دنیا کی علیحدہ علیحدہ سلطنتیں کچھ اس طرح قائم ہوگئیں کہ احساسِ زیاں تک باقی نہ رہا۔

اِس ہزار سال سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی زبوں حالی کے بعد برّصغیر میں پاکستان کا حصول اس مقصد کے لیے تھا کہ یہاں اُمّت محمدیہ کے اِن بکھرے ہُوئے موتیوں کو ایک بار پھر خدا کی رسّی میں پرونے کی مثال کو عملاً قائم کیا جا سکے جس میں نہ دین دنیا کی ثنویت ہو نہ ہی مذہبی اور سیاسی پارٹیوں کا وجود باقی رہے۔ چنانچہ قائدِ اعظم کے اِس احسان کا بدلہ وہی نسل چکا سکے گی جو اِس خطۂ زمین پر حقیقی قرآنی نظام (دینِ خدا) کی حکمرانی قائم کرکے مذہبی تصوّرات کو حرفِ غلط کی طرح ذہنوں سے صاف کردے۔ اس داستان کے تواتر میں آئندہ باب شروع کرنے سے پیشتر میں جناب مرزا فیض کوثر صاحب کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ

کیوں ابھی ذہن کا دروازہ مقفل کردوں
میں ترے غم کا فسانہ تو مکمّل کردوں

لیکن

آپ بیتی بھی سُناتے ہوئے آتا ہے خیال
آنسوؤں سے تری پلکوں کو نہ بوجھل کردوں

دسواں باب

ہماری مساجد

لاؤڈ سپیکر کا استعمال

سوال یہ ہے کہ کیا آج پاکستان کی ۷ لاکھ مسجدیں سابقہ صفحات میں پیش کردہ حقائق کی منہ بولتی تصویریں نہیں؟ اور کیا اس گروہ بندانہ تصورات کو دن رات عام کرنے کے لیے مسجدوں میں لاؤڈ سپیکروں کے استعمال کی یہ حالت نہیں کہ بقول جناب عبدالقادر حسن:

"علمائے کرام پہلے لاؤڈ سپیکر کا ایک آدھ بھونپو لگاتے تھے۔ اب مینارہ کے ساتھ چار چار لگائے ہیں اور دن رات سامنے موجود نمازیوں کے علاوہ سارے کے سارے محلّے کو بھی گرم رکھتے ہیں۔ خود تھک جائیں تو تازہ دم ہونے کے لیے ٹیپ لگا کر تھوڑی دیر آرام کر لینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔"

اور جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:

"پاکستان میں اس وقت یہ مساجد جس طرح شور و غل اور ہنگامہ و نزاع اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے مراکز بن گئی ہیں، پہلے کبھی نہ بنی تھیں۔" (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۸۳ء)

لاؤڈ سپیکر کی جگہ مائیک

مساجد میں لاؤڈ سپیکر کے اس قدر غلط استعمال کو روکنے کے لئے جناب پروفیسر ڈاکٹر سید صدیق حسین صاحب نے بجا طور پر کہا ہے کہ ملک میں لاؤڈ سپیکر آرڈی ننس موجود ہے جس کی رو سے یہ صرف اذان اور جمعہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اس کی پابندی کیوں نہیں کراتے؟ ہمارے ہال تعلیمی اداروں کے آڈیٹوریم، یا ہالوں اور الفلاح سنٹر، جہاں حاضرین کی تعداد چند ہزار تک ہو سکتی ہے مقرر اپنی آواز سامعین تک مائیک کے ذریعے بخوبی پہنچا سکتے ہیں پھر ان مساجد میں جہاں سامعین کی تعداد اس سے بھی کم ہوتی ہے موجودہ لاؤڈ سپیکر کی جگہ مائیک کے استعمال کا قانون کیوں نہیں بنایا جا سکتا۔

جہاں تک ہمارے ان معلمین مساجد کی علمی سطح کا تعلق ہے، تو بقول صدر ضیاء الحق صاحب کے ہماری ان مساجد میں گیارہ[1] ہزار پیش امام اَن پڑھ ہیں۔

---

[1] اس سلسلہ میں راقم کا خیال یہ ہے کہ اَن پڑھوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

مساجد کی قراردادیں

ہماری ان مساجد میں کس قسم کی علمی قراردادیں منظور کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ اس خبر سے لگایا جاسکتا ہے جو روزنامہ جنگ لاہور کے صفحہ ۲ پر متو بھائی کے کالم میں مورخہ ۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو شائع ہوئی اور وہ یہ کہ :

"اسلام آباد کی تیس مساجد میں بیک وقت منظور ہونے والی ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ تمام سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں سے ہر قسم کی تصویریں، فوٹو گراف اور مصوری کے نمونے اتار پھینکے جائیں۔ جن تصویروں کو اتار پھینکنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، ان میں قائدِ اعظم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قرارداد میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ کرنسی نوٹوں سے بھی قائدِ اعظم کی تصویر کو غائب کر دیا جائے۔ مسلمان چونکہ بُت پرستی کے خلاف ہیں، اس لیے نماز پڑھتے وقت ان کی جیبوں میں ایسے نوٹ نہیں ہونے چاہئیں جن پر انسانی تصویریں چھپی ہوئی ہوں۔"

کاش ہمارے یہ علماء دین انسانی تصویروں کو ختم کرانے کے اس علاج کی بجائے مذہبی فرقہ بندی کے دیو ہیکل بت کو ختم کرنے کا کوئی علاج بتا سکتے جس نے مسجد کی عظمت اور تقدس کو پامال کر رکھا ہے اور اس کے باعث یہ ملّت اسلامیہ ڈیڑھ ہزار سال سے اپنی عظمتِ رفتہ کی گم کردہ شان و شوکت اور یکجہتی کی قوّت سے محروم چلی آ رہی ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ حضرات جنہوں نے خود مساجد کی پیشانیوں کو فرقہ بندی کے "سنہری" حروف سے مزّین کر رکھا ہو، وہ اس کا علاج کیا تجویز کریں گے ؟

تھیاکریسی کی تعریف

یہی وہ تھیاکریسی ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے ادارہ "طلوع اسلام" نے تحریر کیا کہ :

"ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ "تھیاکریسی" کی اصطلاح تو عام طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن کسی مثال سے متعیّن طور پر بتایا نہیں کہ تھیاکریسی ہوتی کیا ہے ؟ سُن لیجئے !

"پچھلے دنوں فلمی دنیا کے نمائندوں کی ایک تقریب صدرِ مملکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ اس کی روئداد کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۶ جولائی کی اشاعت میں کہا گیا ہے۔

"اجلاس میں مسعود پرویز نے فلم (مسیح) کا ذکر کیا اور کہا کہ اس فلم کے ذریعے تبلیغ ہوئی ہے۔ اور افریقہ میں بے شمار لوگ یہ فلم دیکھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ فلم پاکستان میں کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ صدرِ مملکت نے مسعود پرویز کے خیالات سے اتفاق کیا اور بتایا کہ انہوں نے بھی یہ فلم دیکھی ہے اور پاکستان کو یہ فلم دکھانا بھی چاہتے ہیں مگر وہ علماء کرام کو راضی نہیں کر سکے۔ انہوں نے بتایا کہ اردن کے علمائے کرام نے بھی اس فلم کی نمائش کی اجازت دے دی تھی۔ اور دیگر

بہت سے مسلمان ملکوں میں بھی یہ فلم دکھائی جا چکی ہے لیکن پاکستان کے علماءِ کرام اس کی اجازت نہیں دیتے لہٰذا ہم مجبور ہیں۔"

یعنی

(۱) سربراہِ مملکت نے ایک فلم دیکھی ہے جس سے ان کے اندازے کے مطابق اسلام کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔

(۲) وہ اس مقصد کے لیے اسے پاکستان میں دکھانا چاہتے ہیں۔

(۳) لیکن یہاں علمائے کرام اس کی اجازت نہیں دیتے۔

(۴) لہٰذا وہ مجبور ہیں۔

کون مجبور ہے؟ سربراہِ مملکت مجبور ہے۔ صدرِ پاکستان مجبور ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجبور ہے۔ یعنی حکومتِ پاکستان مجبور ہے؟ اس لیے کہ علمائے کرام اجازت نہیں دیتے۔

اسے کہتے ہیں تھیاکریسی جس میں حکم مذہبی پیشوائیت کا چلتا ہے۔ حکومت ان کے فیصلوں کے نافذ کرنے کا فقط ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرزِ حکومت کو ختم کرنے کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ طرزِ حکومت نہ اسلام کو باقی چھوڑتا ہے نہ مملکت کو۔

ممکن ہے اب یہ مسئلہ علمائے کرام کے زیرِ غور ہو کہ صدرِ پاکستان ایک ایسی فلم دیکھ چکے ہیں، کہ جس کا دیکھنا ان کے نزدیک جائز نہیں انہیں اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔"

مساجد میں ہاتھا پائی

جب انسانی ذہن مذہبی طور پر فرقہ بندی کے بُت کا پُجاری بن جائے تو اس کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو چار خبروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

"مدرسہ جامعہ حنفیہ قاسمیہ گلبرگ میں آج کالعدم جمعیت علمائے اسلام کے دو دھڑوں کے درمیان اس وقت تصادم ہو گیا جب وہاں ایک روز سیرت النبی کانفرنس کی کارروائی جاری تھی۔ اس موقع پر وہاں زبردست ہنگامہ آرائی ہوئی اور ایک گروپ نے مخالف فریق پر چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ماریں۔ اس کارروائی کے دوران علامہ اختر کاشمیری کو بُری طرح زدوکوب کیا گیا جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے مسلح پولیس کی بھاری جمعیت وہاں پہنچ گئی اور انہوں نے مدرسہ کو گھیرے میں لے لیا۔ گلبرگ پولیس نے مولانا احسان اللہ فاروقی، ان کے بیٹے، برادر نسبتی عنایت مسجد کے امام اور دیگر نامعلوم افراد کے خلاف قاتلانہ حملہ، قتل کر دینے کی دھمکیاں دینے، ہنگامہ آرائی کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا ہے۔ علامہ اختر کاشمیری نے (جن کی رپورٹ پر مقدمہ

درج کیا گیا ہے) کہا کہ مولانا فاروقی نے مجھ پر کلہاڑی سے وار کیا۔ مگر میرے ساتھیوں نے کلہاڑی کا دستہ پکڑ لیا۔ اس دوران ان افراد نے مجھے ٹانگوں اور مکّوں سے بُری طرح زدوکوب کیا۔ اس دوران میری جناح کیپ، گھڑی، پین اور نقدی جس کی مالیت تقریباً پانچ ہزار ہے، اٹھائی گئی اور میری آنکھوں کا چشمہ بھی ٹوٹ گیا۔" (روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۲ء)

اس خبر پر کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے کہ

"کار ملّا فی سبیل اللہ فساد۔"

"فی سبیل اللہ فساد" کی اس سے بہتر تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ دارالعلوم — علمائے کرام — سیرت کانفرنس اور فساد۔

ختمِ نبوّت پر ہنگامہ

یہ دوسری خبر بادشاہی مسجد کی ہے جہاں مسئلہ ختمِ نبوّت پر ایک عظیم اجتماع ہوا۔ جس میں مختلف الخیال علماء حضرات ایک سٹیج پر جمع تھے۔ اس اجتماع کی روئداد ہفتہ وار لیل و نہار کے ۸ تا ۱۴ ستمبر ۱۹۷۴ء کے پرچہ میں پیش کی گئی ہے۔

"مولانا مودودی کی تقریر شروع ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ سٹیج کے عین سامنے ڈیوڑھی میں نعرے بلند ہوئے۔ وہ تقریر کرتے رہے اور نعرے لگاتے ہوئے چند درجن آدمی آگے بڑھنے آئے۔ وہ ڈیوڑھی سے سیدھے مجمع کو چیرتے ہوئے سٹیج کی طرف آ رہے تھے۔ ڈیڑھ دو لاکھ انسان اس طرح بیٹھے تھے کہ کوئی فرد درمیان سے نہیں گزر سکتا تھا۔ ڈیوڑھی سے برآمدوں کی طرف سے ہو کر بھی سٹیج تک آیا جا سکتا تھا مگر معلوم نہیں کیوں آنے والے بیٹھے ہوئے سامعین کے درمیان سے آ رہے تھے۔ ان کی وجہ سے سامعین میں ہل چل مچ گئی۔ لیکن مولانا تقریر کرتے رہے پاس آئے تو معلوم ہوا قومی اسمبلی کے رکن اور جمعیت العلمائے اسلام کے رہنما مولانا مفتی محمود ہیں۔ وہ مجمع کو چیرتے ہوئے سیدھے سٹیج کی طرف آئے۔ ان کے ساتھ نعرے لگانے والے بھی سامنے سے سٹیج پر چڑھے۔ جہاں مولانا مودودی تقریر کر رہے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے کارکن مولانا کو اٹھا کر پیچھے لے گئے۔ ان کے ساتھ ہی پروفیسر عبدالغفور، چوہدری غلام جیلانی، خلیل حامدی، بارک اللہ خاں، اور جماعت کے دیگر تمام کارکن چلے گئے۔ مفتی محمود کے ساتھ آنے والے سٹیج پر مفتیٔ اعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے جن میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے چند معروف

کارکن بھی تھے جنہوں نے جمعیت العلمائے اسلام کے کارکنوں کے بیج لگا رکھے تھے۔ اب سٹیج پر مفتی محمود کے ساتھ آنے والوں کا قبضہ تھا۔ ایک گروہ سید مودودی زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہا تھا۔ لاہور مجلس عمل کا کوئی عہدہ دار سٹیج پر موجود نہیں تھا۔

" اس کے بعد مفتی صاحب تقریر کے لیے اُٹھے، بعض جوشیلے چودہ پندرہ لڑکے نعرے لگانے لگے۔ تمام سامعین اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جمعیت العلمائے اسلام کے کارکنوں نے بھی مفتی محمود زندہ باد کے نعرے لگائے۔ آدھ گھنٹے تک ہنگامہ جاری رہا۔"

یا رسولؐ اللہ اور رسولؐ اللہ کانفرنسیں

جہاں تک نبی اکرمؐ کی ذات کا تعلق ہے ہم سب مسلمانوں کا ایمان ہے کہ خالقِ کائنات کے بعد اس ارض و سما میں نبی اکرمؐ کی ذات اقدس سب سے زیادہ عظیم اور افضل ہی نہیں بلکہ اس قدر مقدم ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن افسوس ہماری اس فرقہ بندی کی تنگ نظری نے آپؐ کی ذاتِ اقدس کو بھی متنازعہ فیہ بنا کر رکھ دیا، حتیٰ کہ بریلوی حضرات کا "یا محمدؐ" کہنا اور دوسری طرف دیوبندی فرقے کا صرف "محمدؐ رسول اللہ" کہنا ایک دوسرے کے لیے جرم ہی نہیں بلکہ کفر قرار پایا۔ یہی وہ کینہ پروری ہے جس کی بنا پر مئی ۱۹۸۴ء میں بادشاہی مسجد میں جناب مولانا عبدالقادر آزاد خطیب مسجد (جن کا تعلق دیوبندی فرقہ سے ہے) کی تقریر کے دوران معاذ اللہ معاذ اللہ مردہ باد کا نعرہ بلند کرنے پر ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ اس معاملہ کو قانون کے سپرد کر دیا جاتا ہر دو فریقین کے سربراہان نے علیحدہ علیحدہ بڑے بڑے پوسٹروں کے ذریعے یہ اعلان جاری کیا کہ وہ ۲۱۔۲۰ مئی ۱۹۸۴ء کو بادشاہی مسجد میں اپنی اپنی کانفرنسوں کا انعقاد کریں گے جہاں یہ حضرات اس "میدان کارزار میں" اپنے اپنے مسلک کو سچ کر دکھائیں گے۔ چنانچہ لاہور ۱۰ مئی ۱۹۸۴ء کو صدر مجلس علمائے اہلِ سنّت علامہ محمود احمد رضوی جو مجلس شوریٰ کے اہم رکن اور رویت ہلال کمیٹی کے صدر بھی ہیں، ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ۲۱ مئی ۱۹۸۴ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں ہونے والی کُل پاکستان "یا رسول اللہ کانفرنس" کے انتظامات کو آخری شکل دے دی گئی ہے۔ اس پریس کانفرنس میں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی۔ مفتی عبدالقیوم (ہزاروی) اور مسٹر رفیق احمد باجواہ بھی موجود تھے۔ علامہ سید محمود احمد رضوی صاحب نے پریس کانفرنس سے کہا کہ وہ اس کانفرنس میں عظمتِ مصطفےٰ کے تحفظ کی خاطر شرکت کریں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ حکومت اس خالصتاً مذہبی کانفرنس کے انعقاد میں رکاوٹ نہیں ڈالے گی

اور جس طرح دوسرے مسلک کے افراد کو بادشاہی مسجد میں اجتماعات منعقد کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح اہلسنت کو بھی "یارسول اللہ" کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دی جائے گی۔

اوقاف کا شعبہ الگ کردیں

اس پریس کانفرنس میں علامہ محمود احمد رضوی صاحب نے یہ مطالبہ کیا کہ اہلِ سنت کے لیے اوقاف کا شعبہ الگ کردیا جائے اور اہلِ سنت کے اوقاف پر کسی دوسرے مسلک کا کوئی فرد تعینات نہ کیا جائے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء۔)

بالفاظ دیگر مسلمانوں کی قبروں کو بھی تقسیم کردیا جائے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ مسلمان مرنے کے بعد بھی اکٹھے رہ سکیں۔

مطالبات

ان مطالبات کے علاوہ ان حضرات کی طرف سے بذریعہ اشتہارات یہ مطالبات بھی کیے گئے کہ:

۱۔ محکمہ اوقاف اہلِ سنت کو علیحدہ کیا جائے کیونکہ محکمہ اوقاف وقف جائدادوں کی شرائط کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور درباروں کی زمینوں کو ایل۔ ڈی۔ اے کے ہاتھ سستے داموں فروخت کر رہا ہے جس سے درباروں کی آمدنی متاثر ہوتی ہے اور اوقاف کی جائیداد اس طرح ختم ہوجائے گی۔

۲۔ بادشاہی مسجد کے خطیب مولوی عبدالقادر آزاد کو فوراً علیحدہ کرکے سنی خطیب کا تقرر کیا جائے۔ مولوی عبدالقادر آزاد ایک متعصب دیوبندی اور نجدی عقیدے کا حامل ہے جیسا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کو ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں اُس نے اعلان کیا تھا کہ بریلوی فرقہ دنیائے کفر کی پیداوار ہے اولیاء اللہ کے مزاروں پر عرس اور میلوں کا انعقاد شرک و بدعت ہے اور وہ یارسول اللہ پکارنے کے حق میں نہیں ہیں۔

۳۔ نعرۂ رسالت کے جواب میں بادشاہی مسجد میں مردہ باد کہنے والے بدنصیب شخص کو تلاش کرکے گرفتار کیا جائے اور نعرۂ رسالت لگانے والوں کو زدوکوب کرنے والے دیوبندی افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

منجانب: (۱) غزالی دوراں علامہ احمد سعید کاظمی
(۲) مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں نیازی
(۳) مفتی محمد حسین نعیمی
(۴) ساقی ملت محمد اکبر ساقی
(۵) مفتی عبدالقیوم ہزاروی

بہرحال بات ہر دو کانفرنسوں کی ہو رہی تھی اور ظاہر ہے ان کانفرنسوں سے سوائے اس کے مزید انارکی اور بدنظمی پیدا ہو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ صوبائی حکومت نے اسی خیال کے پیشِ نظر بادشاہی مسجد میں ان کانفرنسوں کی ممانعت کر دی تاکہ مسجد کے تقدس کو بحال رکھا جا سکے۔

پابندی کے باوجود

لیکن اس کے باوجود روزنامہ جنگ لاہور کے اداریہ بابت ۲۳ مئی ۱۹۸۴ء کے مطابق ۲۱ مئی کی شام کو شاہی مسجد میں بیس ہزار کے لگ بھگ بریلوی حضرات (یعنی یا رسول اللہ کہنے والے) جمع ہو گئے۔ جس کے بعد دیوبندی مسلک کے کچھ حضرات بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بچ بچا کر مسجد میں پہنچ گئے جہاں تصادم کی نوبت آ گئی۔ لیکن موقع پر موجود پولیس نے انہیں الگ کر دیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسی دن دوسری طرف مسجد شیرانوالہ لاہور میں جمعیت اہلِ سنت (دیوبندی) حضرات نے محمد رسول اللہ کانفرنس کا انعقاد کر رکھا تھا۔ چنانچہ اسی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا کہ:

"اس قسم کا تصادم کیا دنیا میں ہمارے لیے تضحیک کا سامان پیدا نہیں کرے گا۔ بیرونی دنیا اور خاص طور پر غیر مسلم دنیا نفاذ اسلام کے لیے ہماری کوششوں سے کیا تاثر لے گی۔"

جناب م۔ش

اس اداریہ کے علاوہ جناب میاں محمد شفیع (م۔ش) نے کہا کہ

"شہر میں فرقہ واریت کی جنگ دراصل گریڈ ۱۹ کے عہدے کے حصول کی جنگ ہے۔"

آپ نے مزید فرمایا: "یہ افراد پاکستان میں سیکولرازم اور الحاد کی راہیں ہموار کر رہے ہیں۔"

وارث میر صاحب

اور جناب وارث میر صاحب نے فرمایا کہ:

"۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شہادت پانے والے علماء کرام کے ورثاء پاکستان کو ایک دوسرے کے لیے کالا پانی بنانے پر تُلے ہوئے ہیں اور پاکستان کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔"

آپ نے مزید فرمایا: "فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم پر تمام یورپ چیخ اُٹھا ہے لیکن ہمارے

علمائے کرام نے کوئی قرار داد منظور کی نہ ہی عصرِ حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے کاوشیں کی گئیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۸۴ء)

ارشاد احمد حقانی صاحب

جناب میاں محمد شفیع (م ش) اور جناب وارث میر صاحب کے علاوہ جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء کو ایک کالم بعنوان "مذہبی اختلافات، بات آخر کہاں رُکے گی" سپردِ قلم کرتے ہُوئے فرمایا کہ (اپنے اپنے مسلک کی بنا پر) مساجد پر قبضوں کے جھگڑے تو پہلے ہی چل رہے ہیں۔ ابھی اگلے روز ایک مسجد میں سنگین واقعہ ہُوا۔ ۶۵ افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈپٹی کمشنر نے مسجد کو سیل کر دیا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا منفرد واقعہ نہیں۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات معمول کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر واقعات ان لوگوں کے درمیان ہو رہے ہیں جو کتابی اور فقہی طور پر ایک ہی مسلک کے پیروکار ہیں لیکن ان کے درمیان دوسرے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اور اب وہ ایک دوسرے سے اس قدر دُور ہیں کہ انہیں ایک ہی امام اور ایک ہی فقہ کا پیروکار کہنا ہی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ مختلف مسلمہ فرقوں کے درمیان اختلافات پہلے ہی طرح طرح کی اُلجھنیں پیدا کر چکے ہیں۔ سکولوں میں اسلامیات کی کتابوں میں نصاب کے الگ الگ حصّے مقرّر ہو چکے ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کے قوانین علیحدہ علیحدہ ہیں۔ دوسرے بہت سے فرقہ وارانہ مطالبات بھی رات دن کیے جا رہے ہیں۔"

جنرل ضیاء الحق صاحب کی اپیل

پاکستان میں دوسری علماء کانفرنس کے سلسلہ میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو خود صدر مملکت جناب جنرل ضیاء الحق صاحب نے علماء سے اپیل کرتے ہوئے فرمایا کہ:

——"وہ مساجد کو گروہ بندیوں کے مراکز نہ بنائیں۔" انہوں نے کہا "مجھے اس بات سے دُکھ ہُوا ہے کہ بعض مکتبہ فکر کے لوگوں نے دوسروں کی مساجد پر عملی طور پر قبضہ کر لیا۔" صدر نے مزید کہا کہ "اختلافات کی وجہ سے اسلام آباد میں ایک مسجد بند پڑی ہے۔" صدر نے علماء سے کہا "وہ خود اس بات کا فیصلہ کر کے حکومت کو آگاہ کریں کہ اذان کی ادائیگی اور دیگر معاملات میں مطابقت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسلام آباد کی مساجد میں اذان کے لیے مختلف اوقات ہیں . . . . . میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک جگہ پر تمام مساجد میں ایک ہی وقت پر اذان کیوں نہیں دی جاتی۔" صدر نے کہا کہ "وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ حکومت سرکاری طور پر اس طرح کے احکامات جاری کرے۔ اس کے لیے خود علماء کو خصوصی تجاویز دینی چاہئیں تاکہ قوم نظم و ضبط کے ساتھ

پیش رفت کرے۔"

(بحوالہ روز نامہ نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۵ رجنوری ۱۹۸۴ء)

راجہ ظفر الحق (سابق) وزیر اطلاعات

راجہ ظفر الحق نے علماء سے اپیل کی کہ جو مساجد اور مدرسوں پر قبضے کے بارے میں تنازعات ہیں تو انہیں ان تنازعات کو مشترکہ کمیٹیوں کے ذریعے باہمی طور پر طے کرنا چاہیئے۔ اور انتظامیہ اور پولیس کو اپنے معاملات میں مداخلت کا موقع نہیں دینا چاہیئے[1]

(روزنامہ جنگ ۱۷رجون ۱۹۸۴ء)

ہمیں ڈر ہے کہ کوئی غیر مسلم ہماری مساجد کی یہ حالت دیکھ کر کہیں یہ نہ کہہ دے کہ:۔

چلئے تو ہو اُسے چلنے حرم کی جنّت میں ——— کرو گے کیا جو حرم بھی خدا کا گھر نہ ہوُا

ہم اپنی حالت سے کس قدر مایوس ہو چکے ہیں، اس کا اندازہ اسلام آباد میں ہونے والی علماء کنونشن کے موقع پر قائم کردہ کمیٹی کی ایک سفارش سے کیا جا سکتا ہے۔

علماء کمیٹی کا تجویز کردہ علاج

"کمیٹیوں نے رائے ظاہر کی ہے کہ تمام فرقوں کو ایک مسلک پر اکٹھا کرنا ممکن نہیں۔ تاہم کوشش کرنی چاہیئے کہ علماء ایک دوسرے کے مسلک کے خلاف جذبات نہ ابھاریں۔ غیر اسلامی پراپیگنڈا کرنے والوں اور اس بنیاد پر منافرت پھیلانے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ علماء کے ۲۲ نکات پر عمل درآمد کیا جائے جو مساجد جن فرقوں کے پاس ہیں، ان کے پاس ہی رہنے دی جائیں البتہ متنازعہ مساجد ان فرقوں کے حوالے کر دی جائیں جن کی اس علاقے میں اکثریت ہے۔[2]

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۸۳ء)

حافظ زبیر احمد ظہیر صاحب کا اعتراف

ہم سمجھتے ہیں کہ اس اقتباس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں سوائے اس کے کہ یہاں جماعت اہل حدیث پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا حافظ زبیر احمد ظہیر کا وہ حقیقت کشا اعتراف نقل کر دیا جائے جو ۱۲رجنوری ۱۹۸ء کو روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت میں نظروں سے گذرا۔ یعنی آپ نے فرمایا:

"۳۵ سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود ابھی تک ہم اسلامی نظام سے محروم ہیں اور یہ محرومی

---

[1] یہ کہنے والے اس قرآنِ حکیم کے حامل ہیں کہ جس نے کہہ رکھا ہے کہ میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ تمہارے باہمی اختلافات کو ختم کر دوں۔

[2] اسی کا نام سیکولر اسٹیٹ ہے جس کے تصور کو ختم کرنے کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔

CamScanner

ملک کی سلامتی اور استحکام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔" انہوں نے کہا کہ "حکمرانوں کی غفلت اور کوتاہیوں کے علاوہ دینی جماعتوں کا انتشار اور فرقہ بندی اسلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اور جب تک تمام دینی جماعتیں فرقہ بندی سے توبہ کرکے اپنے الگ منشور اور الگ الگ وجود ختم کرکے قرآن و سنّت کی بنیاد پر ایک نہیں ہو جاتیں اسلامی نظام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔"

لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اس اعتراف کے باوجود مطالبہ پھر انہیں ۲۲ نکات کے نفاذ کا کیا جاتا ہے جس کی بنیاد ہی فرقہ بندی کو مستحکم کرنے پر مبنی ہے۔ اور پھر اس اعتراف کے باوجود یہ صاحب اِن فرقوں میں سے ایک فرقے کی جماعت کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہیں۔

بیرونِ ملک کی مساجد میں ہنگامے

فرقہ بندی کی بنا پر یہ حال تو پاکستان کا ہے ـــــ جہاں تک بیرونِ ملک کی مسجدوں کا تعلق ہے، تو وہاں کی صورتِ حال کوئی مختلف نہیں۔ ملّتِ اسلامیہ کے ماتھے پر "کلنک کا ٹیکہ" ہر جگہ موجود ہے۔

"راٹھرہام (انگلینڈ) میں پولیس نے ایک مسجد بند کردی۔ حکام نے بتایا کہ دو فرقوں کے مابین اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ چند روز بعد جھگڑے نے مسلّح تصادم کی شکل اختیار کرلی جس میں چھ افراد زخمی ہو گئے اور پولیس نے آٹھ افراد کو گرفتار کرلیا۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء)

مندرجہ بالا خبر کے علاوہ روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء نے اپنے اداریہ میں "مسجد کی ملکیت پر جھگڑا" کے عنوان کے تحت تحریر کیا کہ:

"وارسٹر (انگلینڈ) کی مسجد کی ملکیت پر دو فرقوں کا جھگڑا اندوہناک ہے۔ تین برس کے فساد کے بعد حکومت نے مسجد پر تالا ڈال دیا ہے۔ کیونکہ مقامی مسلمان لیڈران کے وکلاء اور پولیس کی یہ متفقہ رائے ہے کہ دو متحارب فرقے ایک مسجد میں گذارہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ متعلقہ چیریٹی کمشنروں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ مسجد کی قیمت لگائیں اور ایک فرقے سے کہیں کہ وہ دوسرے کا حصّہ خرید لے۔"

چنانچہ خانۂ خدا کی اس "نیلامی" پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اداریہ نگار نے لکھا:

"دل مسلم اس افسوسناک صورتِ حالات پر شرم سے پانی پانی ہے۔ مسجد کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے

اور اللہ کسی فرقے کا حامی نہیں۔ وہ رب العالمین ہے۔ اس کے حضور میں سب برابر ہیں۔ اللہ کے گھر کو بازار میں رکھنا اور اس کی قیمت لگانا، خریدنا اور بیچنا کسی بھی فرقے کے لیے روا نہیں مگر مسلمان خدا پرستی کو چھوڑ کر فرقہ پرستی کے شکار ہو گئے اور عملی زندگی میں ضعفِ اسلام کی بڑی وجہ یہی ہے۔ انگلستان ایک غیر ملک ہے۔ مسلمانوں کو کم سے کم یہاں اسلام کو تماشا بنانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ مسجد محض عبادت گاہ ہی کا مقام نہیں رکھتی، مسلمانوں کا ایک تہذیبی مرکز بھی ہوتی ہے۔ یہ جھگڑے چکانے کی جگہ ہے نہ آپس کی سر پھٹول کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کے امام صاحبان روحِ اسلام سے بہرہ ور نہیں۔ اور اسلام کے نام پر نفاق بین المسلمین کو ہوا دیتے ہیں۔ کیونکہ امامت کا تعلق ان کی روٹی روزگار سے ہے۔ مادہ پرستی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہے۔ مگر فرقہ پرستی کا رجحان کچھ انگلستان سے ہی مخصوص نہیں۔ پاکستان میں بھی رسولؐ اللہ کانفرنس اور یا رسولؐ اللہ کانفرنس میں ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچی جاتی ہیں اور تصاویر اخبارات کے دفتروں میں موجود ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی اور اہلِ حدیث اور اہلسنّت ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ عام مسلمانوں کو مذہبی جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں مگر اکابرین اور علمائے کرام زخم تازہ رکھتے ہیں۔ اسلام جو خدا اور رسولؐ کے نام پر ملّت کی وحدت کی ضمانت تھا، انہوں نے انتشار اور افتراق کا باعث بنا ڈالا اور مختلف فرقے برسرِ پیکار ہو گئے۔ وارسسٹر کی مسجد کا جھگڑا پاکستان میں فرقہ پرستی کے عروج کی علامت ہے۔ اب اس پر عیسائی چیریٹی کمشنر قاضی ہیں تو مسلمان کس کو منہ دکھائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو جسے اللہ پاک نے دینِ مبین کہا فقہی اور مذہبی پیچیدگیوں سے پاک کیا جائے اور فرقہ پرستی پر ضرب لگائی جائے۔ یہ کام اسلام کی صحیح اور بنیادی تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے اور یہ دینی مدرسوں کی ذمّہ داری ہے۔ وہ اپنے نصابات پر نظرِ ثانی کریں۔ تفسیر اور تشریح میں سادگی اختیار کریں اور جزئی اختلافات پر زور نہ دیں ورنہ احیائے اسلام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔"

ایک صاحبِ دردِ دل کی پکار

"اب ہم ایسے زخم بلکہ زخموں کو کریدنا چاہتے ہیں جنہوں نے قوم کے جسم کو ہی نہیں اس کی رُوح تک کو غلیظ اور داغدار کر دیا ہے۔ ان جرائم کی نوعیت ہی نرالی ہے جس کی مثال نہ برطانیہ میں مل سکتی ہے نہ امریکہ میں!

وہ ہیں فرقہ پرستی کے نام پر ہونے والے فسادات کے عقائد کی جنگ۔ جو لوگ اپنے کو مسلمان قرار دیتے ہیں انہیں مُرتد قرار دے کر قتل کے فتوے صادر کرنا ایک محدود گروہ کا یہ دعوے کہ شریعت کی ترجمانی کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جو اس حق کو تسلیم نہیں کرتا وہ نہ صرف فاسق و فاجر بلکہ کافر بھی ہے اور اس قسم کے کافروں کو ملک بدر کر دینا چاہیئے۔ قائدِ اعظم کی ذات پر برصغیر کی پوری اُمّت مسلمہ کا اجماع تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں اس سے بڑا مسلمان لیڈر کوئی پیدا نہیں ہُوا۔ وہ روشن خیالی، ترقی پسندی اور اتحاد بین المسلمین کی اس کہکشاں کی سب سے زیادہ درخشاں ستارے تھے جسے سرسید، حالی، ظفر علی خان، اقبال وغیرہ نے فروزاں کیا تھا۔ قائدِ اعظم کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے تمام مسلمانوں کے فرقوں کو ایک مرکز عمل پر جمع کر دیا تھا۔ اور قیامِ پاکستان کے وقت وعدہ کیا تھا کہ اس ملک میں تھیاکریسی یعنی مذہبی پیشواؤں کی حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ ایک ماڈرن اسلامی مملکت کو وجود میں لایا جائے گا اور اسلام کے اعلیٰ اصول، سماجی عدل، انسانی اخوت، اسلامی مساوات، آزادی رائے اور باہمی مشورے پر مبنی نظامِ حیات قائم کیا جائے گا۔ لیکن قائدِ اعظم کے بعد ہر چیز ان کے تصوّرات کے برعکس ہوئی۔ پاکستان کی تاریخ میں تنگ نظری، تعصب، رجعت پسندی، کفر سازی اور فرقہ پرستی کے غیر اسلامی رجحانات، کبھی اس شدّت و شقاوت کے ساتھ نہ ابھرے تھے جن کا تجربہ آج قدم قدم پر ہو رہا ہے۔ اور نتیجہ بھی صاف ظاہر ہے۔ ترکی میں مذہبی پیشوائیت کا زور (جس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں) جب حد سے گذر گیا تو مصطفےٰ کمال نے سرے سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہی کر دیا۔ ہم جس دَور سے گزر رہے ہیں اور اسلام و شریعت کی اجارہ داری کا دعویٰ کرنے والے بعض گروہ جس شدّت سے سرگرمِ عمل ہیں اس کا ردِّ عمل کتنا شدید ہوگا، اس کا تصوّر ہی لرزہ انگیز ہے۔ یہ کہنا کہ پندرہویں صدی اسلامی نشاۃ ثانیہ (مسلمانوں کی عام بیداری اور عظمت) کی صدی ہوگی۔ اپنے کو فریب دینا اور دوسروں کو بیوقوف بنانا ہے۔ جب تک ہر مسلمان ملک میں قائدِ اعظم کے پائے کا رہنما پیدا نہ ہو یہ خواب، خوابِ پریشاں ہی رہے گا تو جناب یہ فرق ہے ہماری اور انگلینڈ کی اخلاقی حالت میں۔ البتہ وہاں جو مسلمان جا کر آباد ہو گئے ہیں وہ آپس میں اسی طرح دست و گریباں ہیں جس کا نظارہ ہم پاکستان میں کرتے ہیں۔ (جہاں جہاں بھی گئے ننگِ دو جہاں ٹھہرے)"

سو یہ ہے حالت ہماری ان مساجد کی جن میں قرونِ اولیٰ کے مسلمان بغیر کسی تفریق و انتشار کے بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونے کے بعد باہمی مشاورت سے نوعِ انسان کی منفعت بخشی کے لیے عملی پروگرام مرتب

کیا کرتے تھے۔

قبل اس کے کہ ہم سب سے بڑی مسجد (خانہ کعبہ) کے اجتماع کی طرف آئیں، ہماری ان مساجد میں جہاں تک عید کے اجتماع کا تعلق ہے، تو اس کی کیفیت کو جاننے کے لیے علامہ اقبال کا یہ شعر ہی کافی ہوگا ؎

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

حج کا فلسفہ

اہلِ ایمان کے لیے قرآنی نظامِ حیات کو متشکل کرنا کس قدر ضروری اور اجتماعی طور پر نوعِ انسانی کے لیے کس قدر منفعت بخش تھا نیز اس سلسلہ میں قریہ قریہ میں واقع ہماری یہ مساجد کس قسم کا مرکزی کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں سب سے بڑی مسجد خانہ کعبہ میں سب سے بڑے اجتماع "حج" کی غرض و غایت کو جاننا ہوگا جس سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ ملّتِ اسلامیہ آج کس قدر خسارے میں ہے اور علامہ اقبال نے جو یہ کہا تھا کہ ؎ "رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی" کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو جاننے کے لیے ہمیں پرویز صاحب کے ایک درس کا ممنونِ احسان ہونا ہوگا جو طلوعِ اسلام کے ماہنامہ شمارہ مورخہ ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

"آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سُنے ہوں گے اور بار بار سُنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بار بار سُنے ہوں گے لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو۔ اس کے لیے اسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو، وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کر لو اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا۔

تمدّنی زندگی کی ابتدا

نوعِ انسان کی تمدّنی یا معاشرتی زندگی کی ابتدا کب اور کہاں سے شروع ہوئی۔ مغرب کے علماء علم الانسان نے اس باب میں خاص تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے

پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآن کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغازِ سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے، کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) نوع انسان شروع میں ایک اُمّت، ایک جماعت، ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کیے۔ ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور قبیلوں میں بٹ گئے —— اور اس تفریق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلک زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوع انسانی کو محیط ہے۔ اس سے نہ کرۂ ارض کرہ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوع انسان کی یہی کیفیت ہے۔ اس میں نہ اقوام مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں یا مغرب کے ہوں سیّار

انبیاء کی بعثت کا مقصد

قرآن کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہو گئی تھی، اس سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورہ بقرہ میں ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ...

(۲/۲۱۳)

چونکہ نوع انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانین خداوندی کا

ضابطہ لاتے تاکہ وہ اس کی رو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔ یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروان انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا اس کے لیے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک امت کے افراد ہیں جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمت کے افراد۔ اسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے اور سیاسی اصطلاح میں اسے دو قومی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا لیکن اس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیم کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ انہوں نے ماں، باپ، برادری، قوم اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمت کی تشکیل کی اور اس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لیے ایک محسوس مرکز کا وجود لاینفک ہوتا ہے۔ انہوں نے وحی خداوندی کی راہ نمائی میں مکہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعمیر کیا جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (۳/۹۶)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن، رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ مکہ کی مبارک وادی میں خانہ کعبہ تھا۔ یہ کاروان انسانیت کی منزلِ مقصود کے لیے نشانِ راہ تھا۔ اسے تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے "اپنا گھر" (بیتی ۲/۱۲۵) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر "اپنی" کہہ کر پکارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ نہ اس پر کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض اللہ (اللہ کی زمین)۔

للنّاس کا مقصد

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو الناس (نوع انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآن کریم میں آئی ہیں، ان میں ہر جگہ الناس ہی کہا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وحی خداوندی کا مقصود و مطلوب

نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لیے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے "للناس" ہی کہا جانا چاہیئے تھا۔ اور یہی قرآن نے کہا:

اب دیکھئے کہ نوعِ انسان کی اس مرکزیت سے مقصود کیا تھا۔ فرمایا:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ..... (۵/۹۷)

اللہ تعالےٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس کی مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے۔

نیشنل ازم کی تباہ کاریاں

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسانیت، قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سُپر نیشنز ـــــ یعنی مہیب قوتوں کی مالک قومیں اور دوسری کمزور اور غیر نشو و نما یافتہ (UN DEVELOPED) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سُپر پاورز اپنی قوت کے لیے ان کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں وہ اتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد یا امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔ لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان امتِ واحدہ بن جائے تو اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

جائے امن

اب آگے بڑھیئے۔ اس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی۔ سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے، تو افراد خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گزارتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع کرۂ ارض

پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا خطّہ ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبہ کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا :

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط . . . . . (۲/۱۲۵)

اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسانی کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے : وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط . . . . . (۳/۹۷)

جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے، اسے امن کی ضمانت مل جائے گی۔

بات واضح ہے۔ دنیا میں خوف و خطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے جب ان کی جگہ ایک ایسی امّت وجود میں آجائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ بھائیوں کی امن و سلامتی سے رہے گی۔ اسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہوگا نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچیے کہ اس سے یہ کرۂ ارض جو اس وقت جہنّم زار بن رہا ہے کیسا امن و سلامتی کی جنّت بن جائے گا۔

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ نہ حاصل کرلے۔ کعبہ کے متعلق کہا :

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ط (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے۔ اس گھر کے دروازے سب کے لیے یکساں طور پر کھلے ہیں کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں۔ کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (رب الناس) کا گھر ہے اس لیے اس کے دروازے ہر انسان کے لیے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آجائے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد دعا یہ مانگی تھی۔ کہ اس خطّۂ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے لیے وجہ کشش ہو سکے۔ بارالٰہا تُو ایسا کردے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج ادھر آنے لگیں۔ (۱۴/۳۷)

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوع انسان کے لیے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام یا گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے طے کیا ہے، تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح کعبہ سے مراد وہ نظام خداوندی، وہ قرآنی مملکت ہے جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آج صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر چھٹی صدی عیسوی میں آجایئے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہُوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لیے سب سے پہلے ایک اُمّت تشکیل کی گئی جو رنگ نسل خون وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمّت کے وجود کا مقصد کیا تھا اسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا جب کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ..... (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوع انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔" غور کیجئے۔ جس طرح کعبہ کا مقصد نوع انسان کی فلاح و بہبود تھا، اسی طرح اس اُمّت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (للناس) کی خیر طلبی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس اُمّت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رو سے اس اُمّت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ..... (۲/۱۴۳)

"اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمّت بنایا جو تمام نوع انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تمام نوع انسانی پر نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پر تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسول) کی نگاہ رہے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کر لو۔

"یہاں پھر شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" کہا گیا ہے یعنی تمام نوع انسان پر نگران۔ ان خصوصیات کی حامل اُمّت کو ملّتِ ابراہیمی (۶/۱۶۲) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمّت۔

نوعِ انسانی کی امامت

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ..... (۲/۱۲۴)

نوعِ انسان کی امامت (LEADER SHIP) تک ہمارے حصّے میں آئے گی اور اسی بنا پر اس اُمّت سے کہا "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ..... (۲/۱۲۵) تم منصب و مقام ابراہیمی کو کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولان گاہ بناؤ۔" یعنی جس طرح حضرت ابراہیم کو نوع انسان کی امامت کا سزاوار

قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے جس کا مرکز کعبہ ہے، عالمگیر انسانیت کی لیڈر شپ حاصل کرو۔

مشاورت اور صلوٰۃ کا باہمی ربط

اس امت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی۔ (۴۲/۳۸) اس مشاورت کی روزمرّہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے — آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامت صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے۔ (۴۲/۳۸) لیکن پوری ملّت کے مسائل کے لیے مشاورت کے اجتماعات اس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ امّت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا — اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کیے جانے ضروری تھے، انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماع عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا۔ جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ .... (۲۲/۲۷) "تم اعلان کر دو تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لیے آئیں۔" اس اسوۂ ابراہیمی کے اتباع میں اس امّت پر بھی یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ وہ ان اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو امّت کی باہمی مشاورت کے لیے ہوں گے لیکن ان میں شرکت کے لیے تمام انسانوں (الناس) کو دعوت دی گئی ہے۔ یہ بحیثیت مبصر شریک ہوں گے۔ اس سے مقصد کیا ہے، اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح حضرت ابراہیم سے کہا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ .... (۲۲/۲۷) "حج کے لیے تمام لوگوں کو دعوت دو" اسی طرح امّتِ مسلمہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا .... (۳/۹۶) "جو لوگ بھی (الناس) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں انہیں چاہیئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے، (للناس) حج کے اجتماع میں شرکت کریں۔" آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی الناس کہا ہے۔ اسے مومنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

حج النّاس کے لیے ہے

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس

میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزا بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماعات نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی اور حج ابراہیمی کے مناسک اور شعائر مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے کہ یہ تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا۔ اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور روک دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں علاوہ دیگر امور کے باہمی جھگڑے نمٹائے جاتے تھے اور زیادتیاں کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا۔ دلائل و براہین کی رو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی دلیل کے ہیں۔ اس جہت سے قرآنی دلائل کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ..... (۶/۱۴۹) کہا گیا ہے۔ اس لفظ کے ان بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

حج اسلام

قرآن کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتح مکہ سے پہلے (سن ۷ ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا۔ اس لیے وہاں قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد، سن ۸ ھ کا حج تو کم و بیش سابقہ روش پر ادا ہوا۔ لیکن ۹ ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اس میں حضورؐ خود تو تشریف نہیں لے گئے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق کو نمائندہ مملکت قرآنیہ کی حیثیت سے قافلہ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا۔ لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اس پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف، غیر مسلموں (بالخصوص) قریش کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورہ توبہ میں مذکور ہے۔ ۱۰ ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضورؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لیے صحیفہ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نکتہ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ رنگ و نسل، خون، زبان، وطن،

قومیت، ذات پات برادری قبائل ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل، خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع انہیں مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی، جنہیں ارکان و عمال حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دُور دراز مقامات سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لیے میدان عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا ان کا نمائندہ اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لیے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ نمائندگانِ مملکت منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ امورِ مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و محبت کی رو سے کیا جاتا۔ دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر یہ نمائندگان اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

اس کے بعد حج کے اس بنیادی مقصد کی طرف آیئے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کے مقاصد محض فطری تصوّرات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے۔ وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں، جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآن کریم نے اس کا اسی قسم کا مقصد بتایا۔ سورہ حج میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۙ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ ..... (۲۲/۲۸)

"تم لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ حج کے لیے یہاں آیا کریں — دنیا کے دُور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو مشقت سے تھک کر چُور ہو جائیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوع انسان کی) منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے"

نوعِ انسان کی منفعت

اس میں لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ ..... کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبّر کے متقاضی

ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہو سکتا ہے جو محسوس طریقے سے سامنے آجائے۔ یہ دعوت "الناس" کو دی جاتی تھی جس میں اُمتِ مُسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اس امت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کرلیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لیے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے حسنِ عمل اور کارِ خیر کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے اور وہ یہ کہ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ . . . . (۱۳/۱۷) دنیا میں بقا اسی عمل کے لیے ہے جو تمام نوعِ انسان (الناس) کے لیے نفع بخش ہو۔ دین اور اس کے ارکان وشعائر کی غرض وغایت یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لیے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا اور اسی کے لیے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِیَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ . . . .

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جا سکتا لیکن بعض فنی اور تکنیکی معاملات میں ان سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر ایسا کیا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسف بحوالہ شبلی نعمانی) غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مبصر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی بہبود کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص ایسی حرکت نہیں کرے گا جو اِن مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۲/۲۵) اسی بنا پر مشرکین مکّہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ (۹/۳، ۹/۲۸)

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔

ہمارا حج

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد ــ اس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا۔ لیکن جب مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک علیٰ حالہ برقرار رکھتا ہے اور

ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدت مندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو ان کے اپنے دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کیے جاتے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لیے اس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا — بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، خون، وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اسے پھر سے ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لیے ایک نظام تجویز ہوا تھا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ، بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں[1] چالیس پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لیے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لیے توقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس پچاس ہزار حاجیوں کے لیے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرمبادلہ جس قدر صَرف ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی شدّت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ اس میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت، توانائی، روپیہ کے اس صَرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے۔ ان افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے۔ اس قسم کا اطمینان تو تمام اہلِ عرب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں۔

آج کا مسلمان

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح

---

[1] ۱۹۸۵ء میں یہ تعداد ۶۰ ہزار کے قریب تھی۔

غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افراد حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حریم کعبہ میں بھی امام کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت اس اجتماع کی۔ جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ دین جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کے قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیلی مملکت کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ سالہا سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے "مذہب" کے حج کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی بڑی سے بڑی غلط کوش قوم کپکپانے لگ جاتی۔ اب یہ اُمّت غیر مسلموں کی چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی مغضوب علیہ قوم ہیں اس لیے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ ارکان اسلام کی سطحی طور پر پابندی کرتے رہیں۔ اور ان کی غرض و غایت اور مطلوب و مقصود کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد سمجھتی اور دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا ؎

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتباہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ۔ (۴۷/۳۸)

"اور اگر یہ اسی طرح روگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی اور وہ ان جیسی نہیں ہوگی" خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں۔ اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام"

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ اگر کسی چیز کے بلند مقصد کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے صرف یہی نقصان نہیں ہوتا کہ انسان اس کے خوشگوار نتائج سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں اس کی ظاہری حرکات و سکنات جن کے ساتھ وہ بڑی شدت کے ساتھ متمسک ہوتا ہے ان میں بھی کوئی نظم و ضبط باقی نہیں رہتا مجھے اس حقیقت کی وضاحت کے لیے جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کے (قسط وار مضمون سے) ایک دو اقتباسات پیش کرنے ہوں گے جو آپ نے روزنامہ جنگ لاہور کے لیے ماہ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں سپردِ قلم کیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :

جناب حقانی صاحب کا سفرِ حج

"ہجوم کی کثرت کا ایک ناپسندیدہ اور تکلیف دہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حرم شریف میں سکون اور یکسوئی سے عبادت کا امکان قریب قریب یکسر ختم ہو گیا ہے۔ طواف تو خیر مشکل تر ہو ہی گیا ہے دو نفل پڑھنا بھی اب جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ دعا و عبادت میں انہماک پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں اور آپ پر چاروں طرف سے انسانی ریلوں کے تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہوں۔ ہاں رات اور دن کے بعض اوقات ایسے ہیں جب نسبتاً سکون ہوتا ہے لیکن عام طور پر اب بیت اللہ میں دعا اور عبادت کی لذت کا حصول انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۳ر اکتوبر ۱۹۸۴ء)

معلّمین کی ہوسِ زر

اس کے بعد مورخہ ۸ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کی سفرِ حج کی قسط میں حقانی صاحب رقم طراز ہیں۔

"ایک ذمہ دار سرکاری افسر نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی شخص کو عربوں سے متنفر کرنا چاہیں تو اسے حج کے لیے بھیج دیں۔ معلمین کی ہوسِ زر اور حج پر کاروبار میں غلبہ نے اتنے مسائل پیدا کر دیئے ہیں

کہ کوئی حساس انتظامیہ ان کا نوٹس لیے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا معلمین یا مطوفین کی لابی اس قدر طاقت ور ہے کہ ابھی تک اس کا کما حقہٗ توڑ کرنا ممکن نہیں ہوا۔"

زور آور حاجی

اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی قسط میں تحریر کیا :

"عرفات کے میدان میں پانی تو با افراط ہے لیکن بیت الخلاء کا انتظام انتہائی ناقص ... اور تکلیف دہ ہے - اس وقت یہاں مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بیت الخلا نہیں ہیں۔ زمین میں گڑھے کھود کر اور لکڑی کے چوکھٹے رکھ کر عارضی انتظام کیا جاتا ہے - چونکہ دروازے نہیں ہوتے صرف پردے لٹک رہے ہوتے ہیں اس لیے مردوں اور عورتوں کے ایک ہی جگہ ہجوم کی وجہ سے نہایت تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ بالخصوص خواتین کے لیے اس سہولت کو استعمال کرنا ایک آزمائش سے کم نہیں ہوتا - انہیں اندر سے پردہ پکڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے — اس کے باوجود کئی زور آور حاجی صاحبان پردوں کو جھٹکے دینے سے باز نہیں آتے۔"

ہمارا خیال ہے کہ ان اقتباسات کے بعد مزید کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں سوائے علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہہ دیا جائے کہ :

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

آخر پر میری دعا ہے ؎

بڑا غبار بڑی دھول سی ہے راہوں میں
کوئی چراغ جلا دے مری نگاہوں میں

(فیض کوثر)

اور اس کے بعد قبل اس کے کہ ہم عورت کی حالتِ زار، معاشی نظام، ہماری تاریخ، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانے والی تعلیم، قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے تعلقات، سیاسی فرقہ بندی اور دنیا کی حالتِ زار پر گفتگو کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی وادی کے نشیب و فراز کا جائزہ لے لیا جائے۔

گیارھواں باب

تصوّف

جمالیات سے رغبت نہیں جسے کوثرؔ
کچھ اور چیز اُسے کہیئے وہ بشر نہ ہُوا

ایک ضروری گذارش

قبل اس کے کہ ہم تصوّف کی وادی میں خیمہ زن ہوں راقم یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر کیا جائے گا۔ اس سے مقصود صرف اور صرف تصوّف کے متعلق چند ایک حقائق کا بیان کرنا ہے۔ کسی شخصیت یا کسی بزرگ کے عقائد اور نظریات پر تنقید کرنا نہیں۔ میرے نزدیک تو ہر فرد قابلِ احترام ہے۔ خواہ وہ عمر کے کسی حصّے میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ چھوٹے کے لیے شفقت اور بڑے کے لیے احترام کا لفظ چھوٹے اور بڑے میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ورنہ قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق تو خدا تعالےٰ نے عمر کی تفریق کیے بغیر ہر بنی آدم کو واجب التکریم کے الفاظ سے نوازا ہے۔ لہٰذا جس شخص کے نزدیک چھوٹوں کے لیے شفقت کی بجائے اصل لفظ احترام ہی ہو تو وہ اپنے اکابرین اور گزرے ہوئے بزرگوں کے احترام سے کیونکر منحرف ہو سکتا ہے۔ اِس لیے میری خواہش یہ ہے کہ آپ ان گزارشات کو ذاتی انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے ان کا جائزہ خالص علمی و عملی سطح پر لیں۔

باقی جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مَیں نہ کوئی عالم ہوں نہ صوفی۔ قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور اس کی روشنی میں حقیقت تک پہنچنے کے لیے سعی و کاوش میرا مشن ہے اور یہی میری صدا ہے ۔ اور بس

وحی کی راہنمائی

خدائے علیم و خبیر نے جب اس کائنات کو پیدا کیا تو اس نے اس عالمِ خلق کے لیے اپنے عالمِ امر میں قانون اور اقدار بھی وضع کیں تاکہ نظامِ کائنات میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے۔ جہاں تک انسانوں کے لیے راہنمائی کا تعلق ہے، یہ راہنمائی انبیاء کرام کی وساطت سے دوسرے انسانوں تک پہنچا دی گئی اور اسے قرآنِ حکیم کی دفتین میں مکمل غیر متبدل شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ یہ وہ راہنمائی تھی جسے کوئی انسان بھی اپنی خلوت گاہوں، ریاضتوں، مراقبوں، مکاشفات، اوراد و وظائف یا تجربات و مشاہدات سے حاصل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور تو اور خود خدا کا نبیؐ بھی اس حقیقتِ وحی سے آگاہ نہ تھا۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں :

" اور اے محمدؐ ! اسی طرح ہم نے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) تیری طرف اپنے حکم سے ایک

کتاب بطور وحی نازل کی (جس نے تجھ پر حقیقت کو منکشف کر دیا ورنہ) اس سے پہلے تجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ کتاب (الٰہی) کیا ہوتی ہے اور ایمان کس چیز کا نام ہے۔ لیکن (وحی کے ذریعے) ہم نے اس کتاب کو تیرے لیے ایک (عظیم القدر) روشنی بنا دیا جس کے ذریعے ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے کسی ایک یعنی نبی کو حقیقت کا راستہ دکھا دیتے ہیں اور (اے پیغمبر! یہ ہماری اس عطا کردہ روشنی ہی کا صدقہ ہے کہ) تو (گم کردہ راہ لوگوں کی) سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کر رہا ہے۔" (۴۲/۵۲)

"اور اے پیغمبر! خدا نے تمہیں وہ باتیں سکھا دیں جو تجھے پہلے معلوم نہ تھیں" (۴/۱۱۳)

نبوّت کا فریضہ

لہٰذا اب خدا کی طرف سے وحی خداوندی کے مل جانے کے بعد نبی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچا دے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ:

"اے رسول! تیرے ربّ کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے، اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں قاصر رہ جاؤ گے۔" (۵/۶۷)

چنانچہ نبی اکرمؐ نے وحی کی اس تعلیم کے ایک ایک لفظ کو بڑے واضح انداز میں اُمّت تک پہنچا دیا اور گواہی کے طور پر حجۃ الوداع کے دوران ایک لاکھ فرزندانِ توحید سے اس کی گواہی طلب کی اور اس گواہی کو تسلیم کرتے ہوئے خدا تعالےٰ نے فرمایا:

"وہ انہیں احکامِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے اور ان کی غرض و غایت ان کے ذہن نشین کراتا اور اس طرح ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے۔" (۶۲/۲)

اس عطا کردہ وحی کی روشنی میں علم بالحواس کی وساطت سے حقائق تک پہنچنے کے لیے کس قدر تاکید کی گئی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے لگایا جا سکتا ہے جب فرمایا:

"اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگو تم اپنی سماعت، بصارت کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور ہر ان معلومات کی بنا پر اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح نتیجے پر پہنچو یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو تم پر عائد کی گئی ہے اس کی بابت تم سے باز پرس ہوگی کہ تم اس ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوئے تھے یا نہیں۔" (۱۷/۳۶)

دوسری جگہ فرمایا کہ:

"تم شکمِ مادر سے دنیا میں آتے ہو تو اس حالت میں کہ تمہیں کسی بات کا علم نہیں ہوتا خدا تمہیں سماعت و بصارت (ذرائع معلومات) اور پھر ان معلومات کی بنا پر نتائج اخذ کرنے کا ملکہ عطا کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں صحیح نتائج مرتب کر سکیں۔" (۱۶/۷۸)

مقامِ بصیرت

لیکن اس کے برعکس جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

"ان کے سامنے کوئی بات واضح طور پر نہیں آتی وہ ہمیشہ اُلجھاؤ میں رہتے ہیں۔" (۱۰/۱۰۰)

یہ غور و فکر کس قسم کا ہونا چاہیئے ارشاد ہے کہ:

"ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہارے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو اس طرح گویا تمہاری باتیں بڑے غور و خوض سے سُن رہے ہیں حالانکہ وہ محض سُن ہی رہے ہوتے ہیں ان کا خیال کہیں اور ہوتا ہے۔ تم سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سُنا سکتے ہو جو عقل و فکر سے کام ہی نہ لیں۔" (۱۰/۴۲)

"اور وہ لوگ بھی ہیں جو تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور تمہاری طرف تکتے رہتے ہیں گویا وہ ہمہ تن متوجہ ہیں لیکن وہ صرف تک ہی رہے ہوتے ہیں دھیان ان کا بھی کہیں اور ہوتا ہے۔ سوچو کہ تم ایسے اندھوں کو کیسے راستہ دکھا سکتے ہو جو عقل و بصیرت سے کام نہ لیں۔" (۱۰/۴۳)

اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ:

"خدا وہ ہے جس نے تمہیں سماعت اور بصارت اور قوتِ فیصلہ (یعنی ذرائع علم) عطا کیے۔" (۲۳/۶۷) لہٰذا حکم ہُوا کہ "تم سوچا کرو۔" (۳۴/۴۶)

قرآن کریم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ:

"مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھک پڑتے۔" (۲۵/۷۳)

کتاب و حکمت

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے کتاب کے ساتھ جو حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہی قلب و دماغ کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہے کیونکہ عقل و شعور، فہم و ادراک یا علم بالحواس کے تقاضے پورے کیے بغیر علیٰ وجہ بصیرت ایمان پیدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی وہ حقائق ہیں جس کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

"قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری کبھی جزواً کبھی تماماً اور اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کیے ہیں یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی باہم فراہم کرے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآن پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہوگی۔

حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آچکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں خواہ لینن کی۔ حقائق بہرحال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ ٹھیک ہے مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے لہٰذا انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا۔ اس کی تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہوگا۔"

آپ عقل کے اس مقام بلند کو سامنے رکھیے جس کی معرفت سے انسان خدا تعالیٰ کی راہ نمائی سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ انسانی دنیا میں ایک اجتماعی نظام کو متشکل کر سکے اور دوسری طرف تصوف کے اس بنیادی عقیدہ کا جائزہ لیجیے کہ جس کے تحت یہ باور کرایا جاتا ہے کہ علم بالحواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات یقینی ہی نہیں بلکہ یقینی علم وہ ہے جو کشف و الہام کی وساطت سے حاصل ہو جسے اہلِ تصوف باطنی علم یا علم معرفت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی کا تو بیشتر حصہ انہیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

مولانا روم

لا ابالی عشق باشد نے خرد — عقل آں جوید کزاں سودے برد
نے خدارا امتحانے می کند — نے درِ سود و زیانے می زند

مولانا روم کے ان اشعار سے کون واقف نہیں جن میں ان کا کہنا ہے کہ قرآن کا مغز ہم نے نکال لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

مغز قرآن اور ہڈیاں

ما دل اندر راہ جاں انداختیم — غلغلہ اندر جہاں انداختیم!
ما ز قرآں بر گزیدہ مغز را — پوست را پیشِ سگاں انداختیم